SABRAS MEN URDU AFSANE SE MUTA'ALIQ

MAZAMEEN KA TAUZHEEHI ESHARIYA(1995-2016)

(Descriptive Index of articles on short stories published in monthly Sabras Hyderabad 1995 to 2016)

DISSERTATION

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfilment of the requirement for the award of degree

Master of Philosophy

Submitted By

FAHMIDA AYESHAH

Enrollment No. 17HUHL03

Under The Supervision of

DR. MOHD KASHIF

Department of Urdu

School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad - 500046

JUNE-2019

سب رس میں اردو افسانے سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ

(1995 تا 2016)

مقالہ برائے ایم۔فل۔اردو

مقالہ نگار

فہمیدہ عائشہ

نگراں

ڈاکٹر محمد کاشف

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد-500046

جون۔2019

DECLARATION

I, **FAHMIDA AYESHAH**, hereby, declare that this dissertation entitled **"SABRAS MEIN URDU AFSANE SE MUTA'ALIQ MAZAMEEN KA TAUZHEEHI ESHARIYA (1995-2016)"** submitted by me under the supervision of **Dr. MOHD KASHIF** is a bonafide research work wich is also free from plagiarism.

I also declare that it has not been submitted prevouselyin part of full to this University of any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodhganga/INFLIBNET.

Signature of the student

Place: Hyderabad

Date: ....

Name: FAHMIDA AYESHAH

Reg. No.17HULHL03

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled **"SABRAS MEIN URDU AFSANE SE MUTA'ALIQ MAZAMEEN KA TAUZHEEHI ESHARIYA (1995-2016)"** submitted by **Ms. FAHMIDA AYESHAH** Reg. No.**17HUHL03** in partial fulfil of the requirment for the award of the degree of **Master of Philosophy (M.Phil)** in Urdu is a bonafide workcarried out by har under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part of full to this or any other university or institution for the award of any Degree or Diploma.

Signature of the Supervisor

Head of the Department

Dean School of Humanitis

Place: Hyderabad

Date:....................

Department of urdu

School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad

This is to certify that the dissertation entitled **"SABRAS MEIN URDU AFSANE SE MUTA'ALIQ MAZAMEEN KA TAUZHEEHI ESHARIYA (1995-2016)"** submitted by **Ms. FAHMIDA AYESHAH** Reg. No.**17HUHL03** in partial fulfil of the requirment for the award of the degree of **Master of Philosophy (M.Phil)** in Urdu is a bonafide workcarried out by har under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part of full to this or any other university or institution for the award of any Degree or Diploma.

Part af this dissertation has been presented in the following conferenc:

1. Paper titled **"Sabras ki Ilmi-o-Adabi Khidmaat"** one day National Seminar Conducted by Osmania University College for Women Koti, Hyderabad on 11th January 2019.

Signature of the Supervisor

Head of the Department

Dean School of Humanitis

فہرست ابواب

☆ پیش لفظ: 09-11

باب اول: ادارۂ ادبیات اردو اور سب رس: ایک تعارف 12-30

باب دوم: سب رس میں اردو افسانے سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ (1995 تا 2016) 31-121

☆ حاصلِ مطالعہ: 122-127

☆ کتابیات: 128-131

سلسلہ	مضامین	مضمون نگار	صفحہ نمبر
1	فسادات کے افسانوں کے پس پردہ افسانے	حسن منظر	33
2	حنظل (مطالعہ)	ڈاکٹر نثار احمد	34
3	جذبۂ حب الوطنی اور اردو افسانہ	ڈاکٹر بیگ احساس	35
4	چودہ زبانیں چودہ کہانیاں	پروفیسر محمد انوار الدین	36
5	افسانے کا عصری منظر نامہ اور ''تعبیر''	پروفیسر یونس اگاسکر	37
6	''تعبیر'' اور ہم عصر اردو افسانہ	انور قمر	37
7	تعبیر	ندا فاضلی	38
8	''تعبیر'' پر ایک نظر	محافظ حیدر	39
9	''تعبیر'' زندگی کی تلاش	پرول بھردواج	40
10	مظہر الزماں کے نئے افسانے	ڈاکٹر وزیر آغا	41
11	بابِ افسانہ پر مظہر الزماں خاں کی دستکیں	پروفیسر سلیمان اطہر پرویز	42
12	بارہستی۔ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے نئے افسانے	امین راحت چغتائی	43
13	میں اور میرا فن	قدیر زماں	44
14	قدیر زماں ایک فن کار	مضطر مجاز	44
15	ادھورا سفر	بیگ احساس	45
16	قدیر زماں اور ادھورا سفر	رام پرکاش راہی	45
17	قدیر زماں کی افسانہ نگاری	پروفیسر سلیمان اطہر پرویز	46
18	فکشن اور زبان کا مسئلہ (ذاتی کی کہانیوں کے آئینے میں)	ایم۔قمر علیگ	47
19	بیگ احساس کے افسانے: ایک مطالعہ	بلراج کومل	48
20	بیگ احساس کا افسانوی سفر	پروفیسر مغنی تبسم	49

21	حنظل	یوسف ناظم	50
22	حنظل ایک مطالعہ	ڈاکٹر خالد سعید	50
23	سید محمد اشرف کا فکشن: فکری وفنی تناظر	ڈاکٹر صغیر افراہیم	51
24	اشفاق احمد	مرزاحامگ بیگ	52
25	نئی نسل اور کرشن چندر کی افسانوی روایت کا مسئلہ	اقبال مجید	53
26	آزادی کے بعد اردو افسانے کی صورت حال	ڈاکٹر صغیر افراہیم	54
27	کرشن چندر: شخصیت اور فن	پروفیسر اشرف رفیع	55
28	سلام بن رزاق: فسادات اور فرقہ واریت کے افسانے	تسنیم فاطمہ	56
29	اردو کے افسانوی ادب میں مذہبی عناصر	ڈاکٹر قاضی حبیب احمد	57
30	ذوقی کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر عطیہ رئیس	58
31	باہمی اتحاد کی علامت...... پریم چند	صغیر افراہیم	59
32	۱۹۶۰ کے بعد اردو افسانوی ادب کے موضوعات اور اسالیب	نور الحسنین	60
33	ظریفانہ تنقید یا ناقدانہ فکشن	ظہیر علی	61
34	پریم چند کا موضوعاتی تنوع	حسین الحق	62
35	محمد مظفر الدین فاروقی...ایک رجحان ساز افسانہ نگار	شبنم رومانی	63
36	علی باقر......ادوفکشن کی منفرد آواز	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	64
37	منشی پریم چند	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	65
38	طارق چھتاری	سید محمد اشرف	66
39	علی باقر کی افسانہ نگاری	مصحف اقبال توصیفی	67
40	افسانوی شخصیت کا مالک...ابراہیم جلیس	صابر علی سیوانی	68
41	شفق کے افسانوں میں عصری انتشار اور تہذیبی انحطاط کی پیشکش	ڈاکٹر زین رامش	69
42	موجودہ دور میں منٹو کی معنویت	ڈاکٹر محمد کاشف	70

43	قومی یکجہتی کے تناظر میں اردو افسانہ	ڈاکٹر غضنفر اقبال	71
44	ساجد رشید: اردو افسانے کا احتجاجی آہنگ	تسنیم فاطمہ	72
45	بے باک افسانہ نگار: مشرف عالم ذوقی	سید احمد قادری	73
46	اردو کی نئی بستیوں کا نسائی افسانوی ادب	حلیمہ فردوس	74
47	شفق کے افسانے ایک مطالعہ	تسنیم فاطمہ	75
48	نورالحسنین کا افسانوی سفر	محمد کاشف	76
49	عبدالصمد... ایک بلند قامت افسانہ نگار	نورالحسنین	77
50	نیر مسعود کی افسانہ نگاری	شریف احمد خان	78
51	قدیر زماں اور ان کے افسانے... ایک جائزہ	نورالحسنین	79
52	ترنم ریاض کے افسانوں میں کشمیری تہذیب وثقافت	محمد جاوید	80
53	''آسمان سے باتیں'' ایک تجزیاتی مطالعہ	وحیدالظفر خاں	81
54	خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں تصورِ زیست وانسانیت	ابوالکلام	82
55	اردو افسانہ: ایک صدی	عتیق اللہ	83
56	خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ	حامد رجا صدیقی	84
57	رفیق جعفر کی افسانی نگاری	رؤف صادق	85
58	''فقط بیان تک...'' ایک معروضی مطالعہ	سلام بن رزاق	86
59	تاریخی افسانویت	خورشید احمد/ابوالکلام	87
60	کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں میں رومانیت کی سطح	شہناز خاتون	88
61	نیر مسعود بحیثیت افسانہ نگار	عرشیہ تسنیم	89
62	زندگی کی سچائیوں کا بیانیہ... ایک بوند زندگی	معین الدین عثمانی	90
63	بیگ احساس کی افسانہ نگاری ''دخمہ کی روشنی میں''	زبیر عالم	91
64	اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار	اسلم جمشید پوری	92

65	حیدرآباد میں اردو افسانہ (حصہ اول)	صابر علی سیوانی	93
66	کھول دو...وجود اور ضمیر کے منتھن کا استعارہ	ابوالکلام	94
67	حیدرآباد میں اردو افسانہ (حصہ دو)	صابر علی سیوانی	95
68	قاضی عبدالستار کے افسانوں میں تہذیبی کشمکش کا المیہ	خورشید احمد	96
69	نیاز کی افسانہ نگاری	ف۔س۔اعجاز	97
70	قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں مشترکہ تہذیبی عناصر	روبینہ تبسم	98
71	عبدالصمد کے منتخب افسانے: ایک سرسری جائزہ	علی احمد فاطمی	99
72	نئے عہد کی تخلیقیت میں منٹو کی نئی بازیافت	نظام صدیقی	100
73	حقیقت پسندانہ تحریروں کا افسانوی مجموعہ ''لمس''	معین الدین عثمانی	101
74	بیدی کے افسانوں میں اساطیری علائم	عبدالقوی	102
75	عصمت چغتائی کے افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری	محمد سلیم خان	103
76	راجندر سنگھ بیدی کا سلوب	محمد نظام الدین	104
77	ممتاز مفتی بحیثیت افسانہ نگار: ایک تنقیدی مطالعہ	حامد رضا صدیقی	105
78	''پوکلپٹس''ایک تجزیاتی جائزہ	عبدالرحمٰن	106
89	انگارے: تفہیم و تجزیہ	محبوب ثاقب	107
80	شافع قدوائی کی شخصیت اور افسانے کی صنفی تنقید	احمد رشید	108
81	افسانہ، تخلیقی اظہار اور خیال کا ارتقا	ابوبکر عباد	109
82	ابراہیم جلیس: شخصیت اور فن	اسود گوہر	110
83	انتظار حسین: اردو فکشن کا ایک روشن ستارہ	مشتاق صدف	111
84	دیپک بدکی کے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی	توصیف مجید لون	112
85	افسانہ کے تنِ نازک کو سنوارنے والا فنکار ''رتن سنگھ''	صغیر افراہیم	113
86	عابد سہیل کی افسانوی کائنات	فیروز عالم	114

87	اور کیا ہے نیا کہانی میں ...ایک تجزیاتی مطالعہ	احمد رشید	115
88	نئے افسانے میں موضوعاتی تنوع	محمد غالب نشتر	116
89	حسین الحق کی افسانہ نگار: چند اہم معروضات	حنا کوثر	117
90	لامحدود کینوس کا جہانِ معانی میں ڈوبا ہوا احمد رشید کا افسانوی مجموعہ ''بائیں پہلو کی پسلی''	معین الدین عثمانی	118
91	کرشن چندر کا افسانہ ''شہزادہ'' ایک تجزیہ	کمل کشور	119
92	غلام عباس اور جاڑے کی چاندنی	محمد قاسم	120
93	زاہدہ حنا کے افسانوں میں تاریخی شعور	رخسانہ بیگم	121

پیش لفظ

پیش لفظ

گلوبلائزیشن اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی نے انسان کو بے حد مصروف کر دیا ہے۔اس مصروفیت نے انسانوں کو ایک حد تک کتابوں سے دور کر دیا ہے۔اس کے علاوہ کتابوں کے بے پناہ ذخیرے کی وجہ سے اپنے ذوق وشوق کے اعتبار سے کتابوں کا انتخاب کرنا نہایت دشوار کن امر بن جاتا ہے۔ایسے وقت میں اشاریے کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے تا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے۔ایک محقق کو اشاریہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آج جامعات میں اشاریہ سازی کی اہمیت وضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اشاریہ سازی پر تحقیقی کام کروائے جارہے ہیں۔

اشاریہ عربی زبان کا لفظ ہے۔انگریزی میں اشاریہ کے لئے لفظ''انڈیکس''ہوتا ہے جس کے لغوی معنی کتاب کی فہرست ہے۔اشاریہ ہمشہ حروف تہجی کے لحاظ سے ہی ترتیب دیا جاتا ہے۔تا کہ کتاب پڑھنے والے ان تمام مضامین اور مصنفین سے فوری طور پر واقف ہوسکیں جن کا مفصل ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہو۔اس لئے اشاریہ سازی کا کام کافی محنت طلب ہے۔کیوں کہ اشاریہ ایک کتاب کی معلومات کو جو اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے واضح کرتا ہے۔

اشاریہ ترتیب دینے کا ایک عام مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب پڑھنے والوں کو ان تمام مضامین اور مصنفین کا فوراً پتہ لگ سکے جن کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں شامل ہوتا ہے یوں تو بظاہر اشاریہ مرتب کرنا اتنا دشوار گزار عمل نظر نہیں آتا لیکن اشاریہ سازی کے لئے کافی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔اور جس موضوع کتاب، یا رسالہ، مضمون کو لے کر اشاریہ ترتیب دیا جارہا ہے اس سے بھر پور واقفیت ضروری ہے تب ہی صحیح ڈھنگ سے اشاریہ سازی کی جاسکتی ہے۔

میں نے بھی اس اشاریہ سازی کے میدان میں تحقیق کرنے کی ذمہ داری اٹھائی اور اپنی تحقیق کے

لئے رسالہ سب رس کا انتخاب کیا ہے۔ میرا تحقیقی موضوع ''سب رس میں اردو افسانے سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ (1995 تا 2016)'' اس میں، میں نے حتی الامکان موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اشاریہ کے جو اصول ہیں اس کے مطابق میں نے مذکورہ مضامین کا توضیحی اشاریہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مقالہ کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مقالہ کے پہلے باب کا عنوان ''ادارۂ ادبیات اردو اور سب :ایک تعارف'' ہے۔ اس باب میں ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد کی تاریخ اور اس کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی رسالہ سب رس کے ابتدا تا آخر علمی اور ادبی خدمات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح اپنے ارتقائی سفر میں اس رسالے نے ادبی اور علمی میدان میں ایک معیار متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

مقالہ کا دوسرا باب ''سب رس میں اردو افسانے سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ (1995 تا 2016)'' کے عنوان سے ہے۔ دراصل یہی اس مقالے کا تحقیقی موضوع ہے۔ اس باب میں بالترتیب سب رس میں 1995 تا 2016 کے درمیان شامل افسانوی مضامین کا توضیحی اشاریہ تیار کیا گیا ہے، جس میں ہر مضامین کے موضوع اور مرکزی خیال کو پیش کیا ہے۔

حاصل مطالعہ میں مقالہ کا ماحصل اور خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ بعد ازاں کتابیات میں ان کتب و رسائل کا ذکر ہے جن سے مقالے کی تکمیل میں استفادہ کیا گیا ہے۔

مقالے کی تکمیل پر میں سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جس کے کرم اور مہربانیوں نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اس کام کو پائے تکمیل تک پہنچا سکوں۔

میں بے حد ممنون و مشکور ہوں اپنے نگراں ڈاکٹر محمد کاشف صاحب کا کہ میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں میرے یہ چند سی کلمات اس مشفق و مہربان استاد کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے، جس کی بے پناہ محبتیں اور شفقتیں ہمیشہ مجھ پر سایہ فگن رہیں اور جنھوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس مقالے کی ترتیب اور تکمیل میں میری رہنمائی کی۔

اس کے علاوہ میں اپنے شعبے کے تمام اساتذہ کرام کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں، خصوصاً پروفیسر حبیب صاحب صدر شعبہ، پروفیسر فضل اللہ مکرم صاحب، ڈاکٹر عرشیہ جبیں صاحبہ، ڈاکٹر اے آر منظر

صاحب، ڈاکٹر زاہد الحق صاحب، ڈاکٹر نشاط احمد صاحب اور ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ کا جن کے نیک مشورے ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ شعبے کے دفتری عملے کی بھی میں شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے دوران تحقیق میری مدد کی۔

دوران تحقیق میں نے جن لائبریریوں سے استفادہ کیا ان میں اندرا گاندھی میموریل لائبریری یونی ورسٹی آف حیدرآباد، سینٹرل لائبریری مولانا آزاد یونی ورسٹی حیدرآباد اور ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد کے ذمے داران کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے مواد کے سلسلے میں میری مدد کی۔

ساتھ ہی میں بے حد شکر گزار ہوں اپنے والدین کی جنہوں نے میرے لیے اپنے وطن عزیز سے دور رہ کر ہر مرحلے پر میرا ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ بالخصوص دادا محترم لقمان علی مرحوم، دادی محترمہ عریشہ لقمان، نانا شیخ نور الدین مرحوم،، نانی محترمہ نہار النساء، ابو محترم محمد افسر علی صاحب، امی محترمہ نور النہار صاحبہ، بہنوں میں فاطمہ عائشہ اور فوزیہ عائشہ، بہنوئی اظہار الانصای اور پیاری پیاری بھانجی مریم فاطمہ کا انتہائی شکر گزار ہوں، جن کی بصیرت افروز خیالات میرے مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا وسیلہ بنے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اللہ ان سب کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

تاریخ:..............................

فہمیدہ عائشہ

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو
حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

باب اول

ادارۂ ادبیات اردو اور سب رس: ایک تعارف

ادارۂ ادبیات اردو اور سب رس: ایک تعارف

ادارۂ ادبیات اردو کو 1920ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ حیدرآباد کے علاوہ سابقہ ریاست حیدرآباد کے دیگر اضلاع میں اردو زبان و ادب کے فروغ کا کام کرتا تھا اور اس کی ریاست کے اضلاع میں بھی شاخیں تھی۔ اس ادارے کو ابتدا میں 3,500 روپے سالانہ کی سرکاری امداد دی جاتی تھی۔ پھر اس کے بانی ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی حکومت سے نمائندگی کی وجہ سے 1944ء سے یہ امداد بڑھا کر 12,000 روپے سالانہ کر دی گئی۔ حالانکہ سرکاری امداد اس کی ضروریات کی تکمیل کا ایک اہم ذریعہ تھا، تاہم دیگر ذرائع سے بھی مالی ضروریات کی تکمیل بھی ہوتی تھی۔

1944ء سے 1948ء کے بیچ ہر سال پانچ ہزار روپے سالانہ محفوظ کیے جاتے رہے۔ حیدرآباد کے سوماجی گوڑہ علاقے پر جہاں آج ایوان اردو کی عمارت کھڑی ہے وہ ڈاکٹر محی الدین زور کی اہلیہ کا عطیہ تھا۔ مگر ہر سال جمع پیسوں اور کچھ دیگر وسائل سے یہ عمارت مکمل ہوئی۔ عمارت کا افتتاح زور صاحب نے 22 مارچ 1960ء کو کیا تھا۔

ادارہ ادبیات اردو آج کے دور میں بھی اپنی مطبوعات اور رسائل کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات اردو ماہر، اردو عالم، اردو فاضل حیدرآباد و سکندرآباد، اضلاع و بیرون ریاست تلنگانہ کے تمام مراکز پر ایک ساتھ منعقد کرتے آ رہا ہے۔ یہ امتحانات دونوں ریاستوں تلنگانہ اور آندھرا پردیش کے مختلف تعلیمی اداروں میں کئی مساوی قابلیتوں کے برابر تصور کیے جاتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے قائم ہونے کے کچھ سال بعد اس ادارے نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرنا شروع کیا۔ ادارے نے ہمہ جہتی ترقی کی جو رفتار پیدا کی تھی وہ نہ صرف قائم رہی بلکہ اس میں قابل اطمینان اضافہ بھی ہوا۔ چناچہ ادارے نے اردو کی جو خدمات انجام دی وہ قابل ستائش ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے جات آج بھی فعال ہیں اور اپنی خدمات بخوبی انجام دے رہیں، جن میں درج ذیل اہم ہیں:

1۔ شعبۂ زبان

2۔ شعبۂ تنقید

3۔ شعبۂ تالیف وترجمہ
4۔ شعبۂ تاریخ دکن
5۔ شعبۂ شعراو مصنفین
6۔ شعبۂ سائنس
7۔ شعبۂ نسواں
8۔ شعبۂ اطفال
9۔ شعبۂ طلبا
10۔ شعبۂ امتحانات
11۔ کتب خانہ
12۔ شعبۂ رسالہ
13۔ شعبۂ خوش نویسی
14۔ کمپیوٹر کی تربیت کا مرکز
15۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب
16۔ مجلس اشاعت تاریخ وتمدن دکن
17۔ ایوان اردو
18۔ شعبۂ میوزیم

ادارہ کی کوششوں سے شہر حیدرآبد سے باہر جن مقامات پر اردو کا کام انجام پا رہا تھاان کی تعداد 1942 میں 34 تھی، جو بڑھ کر 45 کے قریب پہنچ گئی۔اس وقت ایسے چھ مقامات یعنی ایوت محل، بمبئی، بنگلور، کھام گاؤں، میسوراور ناگپور میں ادارے کی معاون شاخیں اور اردو کے کارگزار مرکز قائم کیے گئے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کامیابی کے سلسلے میں خواجہ حمیدالدین شاہد لکھتے ہیں:

’’ان تمام پریشانیوں کے باجود خدا کا شکر ہے کہ ادارے نے ہمہ جہتی

ترقی کی جو رفتار پیدا کی تھی وہ ۱۹۴۳ء میں بھی نہ صرف قائم رہی بلکہ اس میں قابل اطمینان اضافہ بھی ہوا۔ چنانچہ اس سال ادارے نے اردو کی جو خدمات انجام دیں اتنی شاید ہی اس سے قبل کے کسی ایک سال میں انجام دی گئی ہوں۔''1ِ

ادارۂ ادبیات اردو کی ایک ادبی خدمت اردو امتحانات کا ہے۔اس کے امتحان میں 1942 میں 1148 امیدوار شامل ہوئے تھے۔ یہ تعداد 1943 میں اکیس سو تک پہنچ گئی۔ گویا اس ایک سال ہی میں اتنے امیدوار شریک ہوئے جن کی تعداد گزشتہ سالوں کے جملہ امتحانات کے شرکاء کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ تھی۔اس کے علاوہ ادارے نے تعلیم بالغاں کی جو مہم شروع کی تھی۔وہ ایسی مقبول ہوئی کہ 1943 میں خاص طور پر دو بار اردو دانی کا امتحان منعقد کرنا پڑا تھا۔اس سلسلے میں اس سال اس کی ایک نمایاں کامیابی یہ ہے کہ سرکار عالی کی جملہ افواج کے لیے اردو امتحانات میں شرکت اور کامیابی لازمی قرار دی گئی تھی۔ادارۂ ادبیات کے شعبہ امتحانات کے متعلق ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں بہت سے نوجوانوں کو اپنی زبان و ادب اور تہذیب سے کما حقہ واقف ہونے کا موقع نہیں ملتا، جس کی وجہ سے ان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔علاوہ گھریلو خواتین اور ناخواندہ بالغوں کو اس قابل بنانے کی غرض سے کہ وہ اردو لکھنا پڑھنا سیکھ کر اپنے طور پر کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنی علمی استعداد کو بڑھا سکیں۔ادارے نے مختلف مدارج پر مشتمل ایک نصابِ تعلیم ترتیب دیا اور ریاست کے طول وعرض میں اس کے امتحانات کے مراکز قائم کیے۔ان امتحانوں کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دوسری زبان والوں کو اردو سیکھنے پر مائل کیا جائے۔ادارے کے امتحانات اردو عالم اور فاضل حکومت اور یونیورسٹی کے مسلمہ ہیں۔ان امتحانوں کی وجہ سے ناخواندہ اور کم خواندہ افراد کے

لیے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا رستہ نکل آیا ہے بلکہ ان کے لیے ملازمتوں اور روزگار کے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔''2؎

ادارے کے کتب خانے میں اگر چہ اس وقت کچھ خاص اضافہ نہیں ہوا تھا، لیکن کتب خانے کی تنظیم کا کام مکمل ہو گیا تھا اور کتابوں کی فہرست، مصنفوں اور کتابوں دونوں کے ناموں کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مخطوطات کا ایک تفصیلی تذکرہ ضخیم کتاب کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب جدید ترین تحقیقی انداز میں مرتب اور شائع کی گئی۔ اور اس کی اشاعت ڈاکٹر زور صاحب کی دو سالہ محنت اور تحقیق کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔ کتب خانے کے متعلق ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''ادارۂ ادبیات اردو کے قیام کا ایک اہم مقصد اور اس کے دوسرے مقاصد کی تکمیل کا ایک اہم ذریعہ اس کا عظیم الشان کتب خانہ ہے، جس میں مطبوعہ کتب اور رسائل کے علاوہ قلمی کتابوں کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے۔ اس کتب خانے کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں بلکہ بیرون ملک سے بھی علما اور محققین اس کتب خانے سے استعقادہ کی غرض سے حیدرآباد آتے ہیں۔ ادارے کے کتب خانے میں تقریباً پچاس ہزار مطبوعہ کتابیں اور چار ہزار مخطوطات ہیں۔ اس کتب خانے میں کئی قدیم اور جدید رسائل کی مکمل فائلیں موجود ہیں۔ جن سے محققین اور ادب کے طالب علم مستفید ہوتے ہیں۔3؎

ادارۂ ادبیات کا ایک اور ادبی کارنامہ کتابوں کی اشاعت بہت اہمیت رکھتا ہے۔ شروع میں تو بہت کم کتابیں اس ادارے نے شائع کی ہیں، لیکن وقت کی ضرورت اور مخطوطات کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو نے بہت ساری کتابیں مرتب کروا کر شائع کیا، جو اردو ادب کی بہت نایاب کتابیں ہیں۔ ان

میں سے کچھ کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

1۔	ادارۂ ادبیات اردو	از	خواجہ حمید الدین شاہد
2۔	ماہ لقا اور دوسری نظمیں	از	مولوی عزیز احمد
3۔	پودوں کی کہانی	از	پروفیسر محمد سعید الدین
4۔	طبیعیاتی کائنات	از	پروفیسر سید محمد علیم خان
5۔	ہندوستانی تمدن	از	ڈاکٹر ایشوراٹوپا
6۔	تعلیم کا مسئلہ	از	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
7۔	سچ کا جادو	از	مولوی علی بن عبد الحبیب
8۔	ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم	از	مولوی مراد علی
9۔	افضل الدولہ آصف جاہ پنجم	از	مولوی معاد علی
10۔	باتیں	از	مولوی شجاع احمد
11۔	تذکرہ اردو مخطوطات	از	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
12۔	چیونٹی (طبع ثانی)	از	مہندر راج 4

ان کتابوں کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے۔اس کے علاوہ اردو انسائیکلو پیڈیا کی پہلی جلد بھی شائع کیا ہے۔اس کے بعد ادارے نے کتابیں شائع کرنا کم کر دیا، کیوں کہ شہر حیدر آباد میں اب کئی ناشرین اور ادارے قائم ہو چکے تھے، جو بخوبی اس کام کو انجام دے رہے تھے۔

ادارۂ ادبیات اردو ہندوستان کے مشترکہ قومی تمدن اور اُردو زبان کی خدمت بلا لحاظ مذہب وملت انجام دے رہا ہے چنانچہ اس کے ارباب کار میں حیدر آباد اور دیہات کے سینکڑوں غیر مسلم اصحاب بھی شریک ہیں۔ادارے کے نو مختلف شعبوں کی ترقی کے لئے بھاری رقومات درکار ہیں۔ان نو شعبوں میں تعلیم بالغان، اشاعت کتب، قیام کتب خانہ، تحفظ علمی وادبی آثار، میوزیم، شعبہ نسواں، تیاری اردو انسائیکلو پیڈیا، ماہنامہ کی اشاعت اور دفتری کاروبار کے شعبے شامل ہیں۔ایسے وسیع اور عمدہ خدمات کے پیش نظر ادارے کا سالانہ خرچ

کم از کم پچاس ہزار روپئے ہونا چاہئے تا کہ بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس میں توسیع و ترقی کی گنجائش رہے۔ فی الحال حکومت کی جانب سے 32 ہزار روپئے سالانہ کی مالی امداد اس علمی وادبی ادارے کی ترقی کا باعث ہوگی اور یہ امر حکومت کے لئے دشوار کن نہیں ہے کیونکہ حکومت ریاست حیدرآباد کی جانب سے بیرونی ریاست کے متعدد اداروں کو اس سے بھی زیادہ امداد دی جاتی رہی ہے۔

رسائل کا تعلق ذرائع ابلاغ سے ہے۔ ہندوستان میں مختلف قسم کے رسائل نکلتے ہیں۔ رسائل کی اپنی ہی اہمیت ہوتی ہے۔ رسائل ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ ادبی، علمی، فنی، طبی، قانونی، فلمی اور خالص تفریحی جن کا مقصد محض وقت گزاری ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام رسائل میں کسی نہ کسی شکل میں انسانی مشاہدات و تجربات کے اہم نتائج کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس اعتبار سے رسائل کی دنیا اپنے اندر ایک وسیع کائنات رکھتی ہے۔ رسالہ عربی کے مادہ ''رسل'' سے بنا ہے جس کے معنی پہنچانے کے ہیں اس طرح لفظی حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو رسائل ایک کے خیال کو دوسرے تک پہنچانے کا وسیلہ ہوتے ہیں ان رسائل کے ذریعہ افراد کے رجحان اور پورے معاشرے کی سمت و رفتار کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

اردو ادب میں رسائل کی بہت ہی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اردو ہی کیا دیگر زبانوں میں بھی رسائل کی اپنی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس وقت برصغیر ہندو پاک سے لاتعداد رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ یہ ادبی، نیم ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی، اور دیگر موضوعات پر مستمل ہیں۔ رسائل کی اشاعت کی ایک طویل تاریخ ہے۔ اور موضوعات کے اعتبار سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اہمیت وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے کیونکہ آگے چل کر یہی رسائل تاریخ نویسی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ بعض رسائل کی اہمیت تو کتابوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور ان کا انتظار قارئین کو بے چین کیے رکھتا ہے۔

تحقیق میں مواد کی فراہمی جتنی رسائل سے ممکن ہے کتابوں سے نہیں۔ آج بھی بہت سے ایسے موضوعات ہیں، جن پر مواد مختلف رسائل سے ہی ملتا ہے۔ کتابیں اس سلسلے میں کوئی خاص رہنمائی نہیں کرتیں اس لحاظ سے تحقیق کے میدان میں رسائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کتابوں میں کسی ایک موضوع پر ایک ہی قلم کار کے مضامین ہوتے ہیں اور بیشتر میں یکسانیت ہوتی ہے، لیکن رسائل کے میں متنوع اور جدا جدا انداز نگارش کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر انتہائی معلومات افزا مضامین ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے ادبی رسالوں میں ''سب رس'' کی اپنی انفرادیت ہے۔ پچھلے 80 برسوں سے یہ

رسالہ زبان اور علم و ادب کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ رسالہ ''سب رس'' ماہ نامہ جنوری 1938ء میں زیر نگرانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدرآباد دکن سے جاری ہوا۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی سب رس کے جاری ہونے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ادارۂ ادبیاتِ اردو کے قیام کے بعد اردو کے مشہور محقق و ماہر لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جنوری 1938ء میں ماہ نامہ ''سب رس'' کو جاری کیا۔ عوام اور خواص کی ادبی ذوق کی تسکین کے علاوہ ادارے کی اپنی ترقی اور کام کی وسعت کے لیے ترجمان کی شدت سے ضروری محسوس کی جارہی تھی، جو اپنے مقاصد اور خیالات کو اردو داں طبقے سے روشناس کرا سکے۔ اسی خیال کو عملی صورت میں ''سب رس'' کی شکل میں ترتیب دیا گیا۔ 5''

آج شاید ہندوستان کا کوئی ادبی رسالہ ایسا نہیں ہے جو نصف صدی سے بھی زیادہ کی مدت سے اردو کی خدمت میں آب و تاب سے لگا ہوا ہو۔ پچھلی پون صدی سے علمی اور ادبی مضامین اور شعری تخلیقات کا ایک بہت بڑا سرمایہ ''سب رس'' کی زینت بنتا رہا ہے۔

سب رس کے عہد کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں تحقیقی و تنقیدی مضامین، کے علاوہ غزلیات، مرثیے، مثنویاں، مناجات، گیت، قصائد، طنز و مزاحیہ مضامین، سفرنامے اور سماجی مضامین شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ دکنیات، نمائش، مخطوطات، محفل، شعر و سخن تنقید و تبصرے، افسانے، قطعات، وغیرہ بھی ''سب رس'' کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ان موضوعات اور تخلیقات سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ ماہ نامہ ''سب رس'' کس قدر وقیع اور ادبی رسالہ ہے اور یہ کیسے زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔

رسائل کی ایک اہمیت اس بناء پر بھی ہے کہ ان کے ذریعے تاریخ کے تسلسل کے عمل کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اردو رسالے انیسویں صدی میں شائع ہونا شروع ہوئے اس کی ایک بین مثال رسالہ سب رس ہے جو پون صدی کی ادبی تاریخ کو اپنی جلو میں لیے ہوئے ہے اس لیے ان کے ذریعے کم از کم ڈیڑھ سو برس سے زائد اعرصے کی تاریخ کے نشیب و فراز اور اس کے تسلسل کو سمجھا جا سکتا ہے۔ رسائل اس خلا کو پر کھتے ہیں جو

مسلسل کسی اہم ادبی تخلیق یا تحقیق کے وجود میں نہ آنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ادبی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کی بازیافت میں بھی رسائل مددگار ہوتے ،جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بہت سارے موضوعات یا مضامین یاان کی تخلیقات یاان کے محاسن یا تسامحات کب، کیسےاور کن حالات میں وجود میں آئے۔

رسالہ ''سب رس'' اپنے مضامین کے اعتبار سے اہمیت کا حامل مانا جاتا ہے یہ ایک ایسا ادبی رسالہ ہے جس کی مقبولیت صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرون ملک میں بھی ہے اور وہاں کے محقق اور ادیب رسالہ ''سب رس'' سے اپنی تحقیق کے لیے استفادہ کرتے ہیں۔خصوصا دکنی زبان وادب کے محققین کے لیے سب رس کی فائلیں معلومات کا گنج ہائے گراں مایہ ہیں۔پروفیسر مغنی تبسم ''سب رس'' کی امتیازی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس رسالے (سب رس) کی نمایاں خصوصیت اس کا علمی ادبی تنوع ہے۔آغاز ہی سے یہ خیال پیش نظر رہا کہ اس میں سب کے لیے سب کچھ ہو۔چنانچہ ''سب رس'' میں علمی وتحقیقی مقالوں کے ساتھ تخلیقی ادب کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔اس کے علاوہ عام فہم زبان میں معلوماتی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔سب رس کے اجرا کا ایک مقصد نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی رہا ہے۔اردو کے کئی ادیبوں اور شاعروں کی ابتدائی تخلیقات سب رس میں شائع ہوئیں۔آگے چل کر انہوں نے ادبی دنیا میں اہمیت اور شہرت پائی۔''[6]

حیدرآباد سے نکلنے والے اردو رسائل کا تجزیہ مجموعی حیثیت سے رسائل کی صنفی خصوصیت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتا ہے۔حیدرآباد کے رسائل نے بھی اپنے سماج کی اور اپنے ادوار کی تصویر کشی کے ساتھ تنقید بھی کی ہے،جس کے نمونے ہمیں سب رس میں ملتے ہیں۔حیدرآباد سے نکلنے والے رسائل نے اردو ادب کو کئی مشہور اور نامور ادیب وشاعر دیے۔حیدرآباد کا ایک اہم ادبی رسالہ ''سب رس'' ہے،جس نے شمال وجنوب کے کئی قلمکاروں، محققوں اور نقادوں کو علمی و ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔

آج کے ادبی رسالوں کے مدیروں کے لیے سب سے بڑا یہ مسئلہ ہے کہ رسالے کے مقصد کی مناسبت سے مضمون نگار دستیاب نہیں ہوتے۔ جس کی وجہ سے رسالے کی اشاعت لیت ولعل میں پڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے سب رس کی سر پرستی کرتے ہوئے مضمون نگاروں کا ایسا گردہ پیدا کیا تھا، جو اردو کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے جسکی وجہ سے رسالے کی اشاعت میں کبھی کوئی بد نظمی پیدا نہ ہوسکی جسکے ساتھ انھوں نے ایسے معرکہ آرا نمبر نکالے جن پر اردو دنیا حقیقی معنوں میں فخر کرسکتی ہے۔ دور حاضر میں تمام سہولیتں میسر ہونے کے باوجود بھی ''سب رس'' کے خصوصی نمبروں کے عشر عشیر بھی کام نہیں ہو رہا ہے۔

''سب رس'' نے 80 سال کے عرصہ میں اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کا تفصیل بیان کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ بہر حال اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اکثر مضامین اور نظمیں اتنی مقبول اور مفید ثابت ہوئیں کہ ہندوستان کے بعض رسائل نے ان کو نقل کر کے دوسرے اصحاب کو بھی ان سے واقف کرایا۔ علمی سوغات کے علاوہ ''سب رس'' کی دلکشی اور جاذبیت میں اضافہ کرنے کی خاطر اس میں سیکڑوں قدیم ، نایاب اور قلمی تصویریں شائع کی گیئں۔ جدت اور تنوع پیدا کرنے کے لیے ملک و بیرون ملک کے شہرۂ آفاق حسن کاروں سے کئی سرورق بنوائے گئے۔ بالخصوص ابتدائی دور میں مصور مشرق خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی اور مسٹر خلیل نے ''سب رس'' کے لیے سرورق بنانے میں خاص دلچسپی لی اوران کو خوشنما اور فن کارانہ بنا کر سب رس کے ظاہری حسن کو دوبالا کر دیا۔

''سب رس'' نے ایک طرف علم و ادب کی خدمت کی تو دوسری طرف ملک کے نوجوانوں میں ادبی ذوق اور جوش عمل کی رو دوڑادی۔ سب رس نے نوجوانوں کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی صحیح رہنمائی کر کے ان کی قلمی کاوشوں کو سب رس میں شائع کر کے ان کو اردو دنیا سے روشناس کیا ،جس کے نتیجے میں ڈاکٹر زور کو ہندوستان کے مختلف رسالوں سے ایسے بیسوں خطوط وصول ہوئے جن میں سب رس کے مضمون نگاروں سے یہ خواہش کی گئی تھی کہ وہ ان رسالوں کے لیے بھی اپنے مضامین روانہ کریں۔ بعض اصحاب تو ایسے ہیں جن کی ادبی زندگی کی ابتدا ''سب رس'' ہی میں مضامین کی اشاعت سے شروع ہوئی۔ اور آج وہ اردو دنیا میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے کافی روشناس ہیں۔ ''سب رس'' کے بعض مضمون نگاروں کی کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں اور علمی و ادبی دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ مثلاً شروع کے دور میں رشید قریشی بی۔اے کے کئی افسانے ''سب رس'' میں شائع ہوئے ملک کے اس نوجوان ادیب نے چند ہی مہینوں میں

ہندوستان کے افسانہ نگاروں کی صف میں اپنی جگہ پیدا کر لی اور اکثر رسالوں نے ان کے افسانوں کو ''سب رس'' سے نقل کر کے چھاپا اور بالآخر ادارہ نے ان افسانوں کا ایک نفیس مجموعہ ''من کی دنیا'' کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ مجموعہ ادبی اور افادی دونوں لحاظ سے قابل قدر ہے۔ مختلف رسائل نے اس پر حوصلہ افزا اور بہترین تنقیدیں کی ہیں جن کے اقتباسات ''سب رس'' کے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ سب رس کی مشہور قلمی معاون محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ ایم۔ اے کے کئی مضامین اور بچوں کی نظمیں سب رس ہی میں شائع ہو کر ہندوستان کی اہل قلم خواتین اور ادب اطفال میں مفید اضافہ کا باعث ہوئیں۔ ادارہ نے ان کے اصلاحی اور معاشرتی مضامین کے مجموعے کو جو بطور خاص طبقۂ نسواں کے لیے لکھے گئے تھے ''من کی بپتا'' کے نام سے شائع کیا، کیونکہ اس پر جو تنقید شائع ہوئی ہیں وہ خود اس کی افادیت کا ثبوت ہیں۔ موصوفہ نے بچوں کی نظموں کا مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا۔ بچوں کے سب رس کے متعلق ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

> ''سب رس میں بچوں اور طلبا کے لیے جو ۱۶ صفحے وقف کیے گئے ہیں۔ ان کو ایک علیحدہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے تا کہ جو بچے اور طلبا سب رس نہ خرید سکیں وہ سالانہ ایک روپیہ چندہ میں ہر ماہ سب رس کے اس حصے سے فائدہ اٹھا سکیں، جو ان کی دلچسپی اور روریات کی تکمیل کے لیے مرتب کیا جائے گا۔''[7]

جیسا کہا گیا ہے کہ ماہنامہ سب رس ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (دکن) کا ترجمان ہے۔ ادارہ کی علمی و ادبی سرگرمیاں اور اس کے شعبوں وغیرہ کی رپورٹیں رسالہ ''سب رس'' میں ہر ماہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ سے علم دوست اصحاب ادارہ کے کاموں سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ انہی معلومات کی بنا پر حیدرآباد کے اکثر اصحاب علم و فضل ادارہ کے علمی و تاریخی ذخائر کا وقتاً فوقتاً معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ مقامی صاحبان ذوق کے علاوہ بیرون ملک سے جو علماؤ فضلا اور مشاہیر حیدرآباد آتے ہیں وہ بھی ادارہ ادبیات اردو کے معائنہ کیلئے ضرور تشریف لاتے ہیں۔ اس بنا پر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ملک اور بیرون بلکہ دونوں جگہ ادارہ کی اہمیت کیا ہے اور اس ادارہ نے اردو ادب کو ایک ایسا رسالہ دیا، جس کی مقبولیت صرف ہندوستان میں ہی نہیں

بلکہ دوسرے ملک میں بھی بہت اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

سب رس ایک بہت ہی اہم علمی و ادبی اور تحقیقی رسالہ ہے جو پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں زبان وادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر عالمانہ اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا ترجمان ہے۔ ادارہ ادبیات اردو ہندوستان میں اردو کا ایک اہم مرکز ہے جس کے نادر ذخیرہ سے ملک اور بیرون ملک کے محقق اپنے تحقیقاتی کام کے سلسلے میں آئے دن استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

سب رس کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کی وہ سب کے لئے ہو۔ وہ سب کے لئے اسی وقت بن سکتا تھا جب اس میں سبھی کی دلچسپی بنتی۔ مضامین کے انتخاب میں بھی وسیع النظری کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ افسانوں، نظموں، علمی، ادبی اور تنقیدی مضمونوں اور اردو کی مطبوعات پر غیر جانبدارانہ تنقیدوں کے سوا دیگر موضوعات پر بھی دلچسپ مضمون چھپتے رہتے ہیں اس میں نہ صرف دکن بلکہ تمام اردو دنیا کے اچھے شاعروں اور انشاپردازوں کی نظمیں اور مضامین حاصل کرنے اور چھاپنے کا التزام کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر زور کا بنیادی مقصد دکنی زبان وادب کی بازیافت تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے ادارے سے الگ ہٹ کر بھی بہت کام کیا تھا۔ جب انہوں نے سب رس جاری کیا تو یہ بنیادی پہلو بھی ملحوظ رکھا کہ دکنی ادب کے نوادارت اور جواہر ریزوں کو ادبی دنیا سے متعارف کرایا جائے۔

اردو میں ادبی رسائل کی تاریخ اس اعتبار سے بہت المناک رہی ہے کہ بہت سے اچھے رسائل کم سنی میں دم توڑ گئے اگر اچھے رسائل کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو ان میں ہمایوں، عالمگیر، نیرنگ خیال، ادبی دنیا، ساقی، نگار، حسن، دبدبہ آصفی، دکن ریویو اور اردو کے نام لیے جا سکتے ہیں مگر ان میں اردو اور نگار کو چھوڑ کر بقیہ سب تخلیقی ادب کو اپنا سہارا بنائے ہوئے تھے اور تنقید کبھی کبھی مگر تحقیق کا تصور ان رسائل کے پاس نہ تھا۔ البتہ اردو اور نگار میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں سب رس ایک تحقیقی رسالہ ہے لیکن بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

اردو رسائل کی تاریخ میں ''سب رس'' وہ واحد رسالہ ہے جس نے نہ صرف اپنے معیار کو بلند رکھا بلکہ گزشتہ 80 برس سے برابر شائع ہوتا آ رہا ہے۔ اس رسالہ نے کئی اہم خاص نمبر بھی شائع کیے جن کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، جو محمد ناظم علی کی کتاب سے لیے گئے ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	خصوصی اشاعت
1	مارچ	1938ء	محرم نمبر
2	جون	1938ء	اقبال نمبر
3	اگست	1938ء	حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس
4	جنوری	1938ء	مرقع دکن نمبر
5	جنوری	1938ء	اردو نمبر
6	جنوری	1939ء	ریڈیو نمبر
7	فروری	1940ء	جنگ نمبر
8	مئی	1941ء	ادارہ ادبیات اردو نمبر
9	جولائی	1942ء	ترقی پسند ادب نمبر
10	مارچ،اپریل	1948ء	میکش نمبر
11	اپریل	1949ء	سالار جنگ نمبر
12	ستمبر	1949ء	افسانہ نمبر
13	فروری،مارچ	1954ء	خاص نمبر
14	جون،جولائی،اگست	1954ء	حیدرآباد اردو کانفرنس
15	فروری،مارچ	1955ء	جشن سیمیں ۵۵ء ادارہ ادبیات اردو
16	جنوری،فروری،مارچ	1956ء	سالگرہ نمبر
17	مارچ،اپریل	1956ء	صفی نمبر
18	جولائی،اگست	1956ء	امجد نمبر
19	جنوری	1957ء	ادارہ نمبر
20	اپریل،مئی،جون	1958ء	خاص نمبر قلی قطب شاہ
21	جنوری	1960ء	محمد قلی قطب شاہ نمبر

22	مارچ	1960ء	ادارہ نمبر
23	مئی	1960ء	ایوان اردو نمبر
24	جنوری	1960ء	محمد قلی قطب شاہ نمبر
25	اپریل	1961ء	ادارہ نمبر
26	جون	1961ء	ٹیگور نمبر
27	جنوری	1962ء	محمد قلی قطب شاہ نمبر
28	مارچ	1962ء	ادارہ نمبر
29	مئی، جون	1962ء	امجد نمبر
30	جولائی	1962ء	عزیز جنگ ولا نمبر
31	جنوری،فروری	1963ء	ظفر نمبر
32	اپریل	1963ء	ادارہ نمبر
33	اکتوبر،نومبر، دسمبر	1963ء	زور نمبر
34	فروری	1964ء	یوم قلی قطب شاہ نمبر
35	مئی	1965ء	ادارہ نمبر
36	جنوری	1965ء	ہاشمی نمبر
37	جولائی	1965ء	ادارہ نمبر
38	اپریل	1966ء	یادگار محمد قلی قطب شاہ
39	اگست	1966ء	ادارہ نمبر
40	اکتوبر	1966ء	یوم زور نمبر
41	اگست	1967ء	ادارہ نمبر
42	جولائی	1968ء	یوم قلی نمبر
43	ستمبر	1968ء	ادارہ نمبر

نجیب اشرف ندوی نمبر	1969ء	اپریل	44
غالب نمبر (پہلا حصہ)	1969ء	ستمبر، اکتوبر	45
غالب نمبر (دوسرا حصہ)	1969ء	دسمبر	46
ادارہ نمبر	1970ء	جولائی	47
سالنامہ	1971ء	جنوری	48
عنایت جنگ نمبر	1971ء	اپریل	49
ادارہ نمبر	1972ء	فروری	50
خاص شمارہ یوم قلی	1972ء	جون	51
نظیر نمبر	1972ء	جولائی	52
ادارہ نمبر	1972ء	ستمبر	53
احتشام نمبر	1973ء	مارچ	54
ادارہ نمبر	1973ء	اکتوبر	55
ادارہ نمبر	1974ء	ستمبر	56
ادارہ نمبر	1975ء	جولائی	57
یوم محمد قلی قطب شاہ	1976ء	مارچ	58
سالنامہ	1977ء	جنوری	59
اقبال نمبر	1977ء	نومبر	60
یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر	1977ء	مارچ	61
اریب نمبر	1980ء	ستمبر	62
زور نمبر	1980ء	نومبر	63
پروفیسر علی اکبر نمبر	1983ء	ستمبر، اکتوبر	64
عالم خوندمیری نمبر	1985ء	جنوری	65

66	ستمبر، اکتوبر	1986ء	سکینہ بیگم نمبر
67	مارچ	1987ء	سلور جبلی تقاریب یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر
68	مئی	1988ء	محمد قلی قطب شاہ نمبر
69	ستمبر	1989ء	محمد قلی قطب شاہ نمبر
70	اکتوبر	1989ء	محمد علی عباسی نمبر
71	نومبر، دسمبر	1990ء	ڈاکٹر حفیظ قتیل نمبر
72	اگست	1991ء	ڈاکٹر سکینہ الہام نمبر
73	جنوری، فروری، مارچ	1993ء	عابد علی خان نمبر
74	مئی، جون	1996ء	یوم قلی قطب شاہ
75	مارچ	1998ء	محبوب حسین جگر نمبر
76	اپریل	1998ء	محمد قلی قطب شاہ نمبر
77	نومبر	1998ء	تہنیت النساء بیگم نمبر
78	ستمبر	1999ء	زور نمبر
79	دسمبر	2001ء	خواجہ حمید الدین شاہ نمبر
80	فروری	2006ء	غالب نمبر 8

سب رس کے خصوصی گوشے

1	سب رس جنوری 2002	جلد 6، شمارہ 10	گوشہ پروفیسر بیگ احساس
2	سب رس جون 2007	جلد 69، شمارہ 6	ممتاز افسانہ نگار گوشہ علی باقر ششند رشرما

3	سب رس نومبر 2007	جلد 69،شمارہ 11	گوشہ سید تقی الدین قادری
4	سب رس ستمبر 2008	جلد 70،شمارہ 9	گوشہ ڈاکٹر شاہد صدیقی

سب رس کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ ادبی تاریخ پیش کی گئی ہے بلکہ اس دور کے ہر طرح کے رجحانات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ فرق بھی سامنے آتا ہے، جو حیدرآباد اور شمالی ہند کے رسائل میں ہے اور وہ دراصل حیدرآباد کے ایک مخصوص رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔

رسالہ ''سب رس'' کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کی اس نے اردو کے بلند پایہ انشاپردازوں ، شاعروں، ادیبوں کے علاوہ دوسری زبانوں خاص کر ہندی، مرہٹی، تلیگو اور کنڑی وغیرہ کے جدید ادبی جواہر پاروں سے اردو کو متعارف کرایا۔ سب رس کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے محترمہ عطیہ رحمانی لکھتی ہیں:

> ''سب رس ایک طرف تو علم وادب کی خدمت کرتا رہا تو دوسری طرف ملک کے نوجوانوں، ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کو اپنا منصب بنایا۔ سب رس معلومات اور بچوں کا سب رس آگے چل کر بند ہو گئے، لیکن ''سب رس'' اب بھی علم وادب کی شمع جلائے ہوئے ہے۔'' 9

رسالہ ''سب رس'' کو اردو کے بڑے قلم کاروں ، ناقدوں ، ادیبوں اور محققوں نے اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے ذریعہ نہ صرف زینت بخشی بلکہ اس کے مقام کو بلند اور معیاری بنایا۔ مدیر اوّل ڈاکٹر محی الدین قادری زور تو ماہرین لسانیات دکنی ادب کے جویا اور محقق تو تھے ہی جنھوں نے انتہائی تحقیقی پر مغز معلوماتی، تہذیبی و ثقافتی مضامین لکھے ان کے علاوہ پروفیسر عبدالقادر سروری، شمس اللہ قادری، نصیرالدین ہاشمی، ، پروفیسر عبدالمجید صدیقی ، سید محمد، پروفیسر عالم خوندمیری ، پروفیسر ہارون خان شیروانی ۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، پروفیسر غلام عمر خاں، پروفیسر اشرف رفیع ، پروفیسر نثار احمد فاروقی ، پروفیسر عبدالقدوس ، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر محمد علی اثر ، پروفیسر سید سراج الدین ،سلیم تمنائی ، جاوید وششت ،

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر احتشام ندوی، پروفیسر محمد نسیم الدین فریس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر آل احمد سرور، قاضی عبدالغفار، جیسے اہل نظر محقق اور نقادوں کے علاوہ مخدوم محی الدین، سکندر علی امجد، جہاں بانو نقوی، امجد حیدرآبادی، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی، علی احمد جلیل، ابن احمد تاب، بانو طاہرہ سعید، منظور احمد، کیفی اعظمی، شاذ تمکنت، اقبال متین، احمد ندیم قاسمی، میر تقی علی خاں ثاقب، وغیرہ جیسے شعراء کی نگارشات بھی شائع ہوتی تھیں۔ رسالہ ''سب رس'' اپنے مضامین کے بنا پر اور اپنی تحقیق و تنقید کے بنا پر اردو رسائل کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ اردو ادب میں اس کی اپنی ایک الگ ہی اہمیت ہے جو اردو دنیا میں اپنا مقام رکھتی ہے۔

☆☆☆

حوالے:

1۔خواجہ حمیدالدین شاہد، دیباچہ، ادارۂ ادبیات اردو، اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن، 1943، ص03
2۔ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر زور کے آباواجداد، مشمولہ: رہنمانہ مضامین اردو، ایم۔اے سال آخر، پرچہ سوم، خصوصی مطالعہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مرکز برائے فاصلاتی تعلیم، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ص33
3۔ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر زور کے آباواجداد، مشمولہ: رہنمانہ مضامین اردو، ایم۔اے سال آخر، پرچہ سوم، خصوصی مطالعہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مرکز برائے فاصلاتی تعلیم، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ص34
4۔خواجہ حمیدالدین شاہد، دیباچہ، ادارۂ ادبیات اردو، اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن، 1943، ص05
5۔ڈاکٹر محمد ناظم علی، حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد سے حال تک، گونج پبلی کیشنز، نظام آباد، 2010، ص50
6۔پروفیسر مغنی تبسم، ادارۂ ادبیات ارود، ایک تعارف، سب رس، مارچ 1982، ص6
7۔ڈاکٹر زور، سب رس جلد اول، شمارہ اول، جنوری 1938، اداریہ
8۔ڈاکٹر محمد ناظم علی، حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد سے حال تک، گونج پبلی کیشنز، نظام آباد، 2010، ص53-54
9۔عطیہ رحمانی، داکٹر زور شخصیت اور کارنامے، ص106

باب دوم

سب رس میں اردو افسانے سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ

(1995 تا 2016)

سب رس میں اردو افسانے سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ

(1995 تا 2016)

ادبی تحقیق میں مواد کی فراہمی کا ایک وسیلہ رسائل بھی ہیں۔ بلکہ رسائل کو کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ کتابیں محقق کی نظر میں ہوتی ہیں لیکن رسائل ایسے سمندر کے مانند ہوتے ہیں، جو اکثر خود بھی مخفی ہوتے ہیں، لیکن ان کے دامن میں مواد کے گوہر آبدار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ان تک رسائی ریگستان میں پانی تلاش کرنے کے مانند ہے۔ مواد کی تلاش میں ریسرچ اسکالران میں سے ہر رسالے کی فائل کھنگالے یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے ایک لمبی عمر درکار ہے۔ اس مشکل گھڑی میں جادہ تحقیق کے مسافر کی رہنمائی رسائل کا اشاریہ کرتا ہے، جو اسے بتاتا ہے کہ اس کا مطلوبہ مواد کس رسالے میں ہے۔

اشاریہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ انگریزی میں اشاریہ کے لئے لفظ ''انڈیکس'' ہوتا ہے جس کے لغوی معنی کتاب کی فہرست ہے۔ اشاریہ ہمیشہ حروف تہجی کے لحاظ سے ہی ترتیب دیا جاتا ہے۔ تاکہ کتاب پڑھنے والے ان تمام مضامین اور مصنفین سے فوری طور پر واقف ہوسکیں، جن کا مفصل ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہو۔ اس لیے اشاریہ سازی کا کام کافی محنت طلب ہے۔ کیوں کہ اشاریہ ایک کتاب کی معلومات اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے واضح کرتا ہے۔

اشاریہ ترتیب دینے کا ایک عام مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب پڑھنے والوں کو ان تمام مضامین اور مصنفین کا فوراً پتہ لگ سکے جن کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں شامل ہوتا ہے یوں تو بظاہر اشاریہ مرتب کرنا اتنا دشوار گزار عمل نظر نہیں آتا لیکن اشاریہ سازی کے لئے کافی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس موضوع کتاب، یا رسالہ، مضمون کو لے کر اشاریہ ترتیب دیا جارہا ہے اس سے بھرپور واقفیت ضروری ہے تب ہی صحیح ڈھنگ سے اشاریہ سازی کی جاسکتی ہے۔

میں نے بھی اس اشاریہ سازی کے میدان تحقیق کرنے کی ذمہ داری اٹھائی اور اپنی تحقیق کے لیے رسالہ سب رس کا انتخاب کیا۔ میرا تحقیقی موضوع ''سب رس میں اردو افسانے سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ (1995 تا 2016)'' ہے۔ میں نے موضوع سے انصاف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
1	جولائی	1996	فسادات کے افسانوں کے پس پردہ افسانے	حسن منظر	24-30	58	01

حسن منظر نے اس مضمون میں فساد کے افسانوں کے پس پردہ کہانی کو بیان کیا ہے، یعنی کہ اس میں ان سارے واقعات کو قلمبند کیا ہے، جن وجوہات یا جس کے سبب فساد ہوئے۔نہوں نے اس مضمون کی ابتدا آزادی 1947ء کے واقعے سے کی ہے، جو ہمارے ملک کے لیے ایک سیاہ تاریخ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حسن منظر نے آزادی حاصل کرنے کے قیامت خیز واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اس مضمون میں چند واقعات کا ہی ذکر کیا ہے، جب کہ 1947ء میں بے شمار واقعے ہوئے جنہوں نے ملک کی عوام کے ساتھ ساتھ تخلیق کاروں کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس واقعے سے ہمارا ملک تقسیم ہوا، لوگ بے گھر ہوئے، لوگوں کو ہجرت کا کرب جھیلنا پڑا، عورتوں کی عصمت دری کی گئی، ان پر ظلم ڈھایا گیا، وغیرہ وغیرہ۔ان تمام واقعات پر ادیبوں نے افسانے، کہانیاں اور ناول لکھے۔

اس مضمون میں حسن منظر نے مختلف واقعات کی نشاندہی ضرور کی ہے لیکن، مضمون کے آخر میں انہوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ میرا یہ مضمون اس عورت کی مظلومیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا ذکر مضمون کے آخر میں آیا ہے۔ نامعلوم وہ عورت کون تھی اور ایک تھی یا پھر کئی عورتیں تھیں، جن پر لوگوں نے افسانے پہ افسانہ لکھ دیا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
1,2,3	59	37-39	ڈاکٹر نثار احمد	حنظل (مطالعہ)	1997	جنوری، فروری، مارچ	2

''حنظل'' بیگ احساس کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے، جو 1993ء میں منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر نثار احمد نے اس مجموعے کے تمام افسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ہر افسانے کے متعلق مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد کے مطابق پہلے حصے میں وہ افسانے ہیں، جو علامتی انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے قرآن، ہندو دیومالا اور داستانوں سے کردار مستعار لے کر انہیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے افسانوں میں پرویا گیا ہے۔ اس حصے میں ''نیا شہہ سوار''، ''خس آتش سوار''، ''آسمان بھی تماشائی''، ''برزخ'' اور ''حنظل'' شامل ہیں۔

دوسری قسم کے وہ افسانے ہیں، جو تمثیلی اور بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ بیگ احساس نے تمثیلی فضا پیدا کرنے کے لیے مختلف جانوروں کو کردار بنایا ہے۔ اس حصے میں ''کرفیو''، ''سوانیزے پر سورج''، ''ملبہ'' اور ''بے سورج آسمان'' جیسے افسانے شامل ہیں۔

اس مجموعے کا آخری افسانہ ''اجنبی اجنبی'' کے عنوان سے ہے، جس میں علامت اور تمثیل دونوں سے کام نہ لے کر صرف بیانیہ سے ہی کام لیا گیا ہے۔ ان تمام کہانیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد نثار احمد نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کہ بیگ احساس کا شمار آٹھویں دہائی کے ان افسانہ نگاروں میں ہونا چاہیے، جنھوں اپنے بیانیہ اور منفرد اسلوب کی بنا پر اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
08	60	7-16	ڈاکٹر بیگ احساس	جذبۂ حب الوطنی اور اردو افسانہ	1998	اگست	3

ڈاکٹر بیگ احساس نے مذکورہ مضمون کے ابتدا میں 1857ء کے انقلاب کے باعث ہوئی ملک کی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور مغلیہ حکومت کے زوال کے اسباب کو قلمبند کیا ہے۔اس کے بعد مختلف افسانہ نگاروں کے حب الوطنی سے سرشار افسانے کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے پریم چند کا ذکر کرتے ہوئے ان کے افسانوی مجموعے ''سوز وطن'' کے تمام افسانوں کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد ان کے دوسرے افسانوں مثلاً ''جیل،ستی''،''رانی سارندھا'' میں جذبۂ حب الوطنی کی نشاندہی کی ہے۔اس کے بعد اس دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں پیش کیے گئے جذبۂ حب الوطنی کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔جس میں مجنوں گورکھپوری کا افسانہ ''محبت کی قربانیاں''، کرشن چندر کا ''دوفرلانگ لمبی سڑک''،''ان داتا''،خواجہ احمد عباس کا ''ایک پائیلی چاول''،اختر اورینوی کا ''جنگل'' اور میرزا دیب کا ''کنگال دیش میں'' شامل ہے۔

مضمون کے آخر میں بیگ احساس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو افسانے نے ابتدا سے لے کر تقسیم ہند تک حب الوطنی کے جذبے کو جگانے اور جدوجہد آزادی کی لے تیز کرنے میں موثر رول ادا کیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ افسانہ ہی وہ واحد صنف ہے،جس میں ہنگامی موضوعات اور وقتی جذبات کو خوبصورت اسلوب اور بہترین تکنیک کے ذریعے پیش کیا جاسکتا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
4	اگست	1999	چودہ زبانیں چودہ کہانیاں	پروفیسر محمد انوارالدین	59-60	61	08

''چودہ زبانیں چودہ کہانیاں'' کہانیوں کا مجموعہ ہے،اس مجموعے میں ہندوستان کی مختلف ریاستی زبانوں کی چودہ کہانیاں شامل ہیں، جسے عظیم الدین عظیم نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرایا ہے۔اس کو شائع کرانے کے لیے انہوں نے تخلیق کاروں سے باقاعدہ طور پر اجازت بھی لی ہے۔

اس مجموعے میں ہندوستانی زبان کی مختلف کہانیاں مثلاً ''مشک ہرن (اڑیہ)''، ''شہر (آسامی)''، ''گناہ (بنگلہ)''، ''خالی ہاتھ (پنجابی)''، بوڑھا آدمی (تمل)''، ''راستے پر وہ آدمی (تلگو)''، ''انتظار (راجستھانی)''، ''بھائی عبدالرحمٰن (سندھی)''، ''دلہن کی شلوار (کشمیری)''، ''جوگی انجیا کی مرغی (کنڑ)'' ''غلام مزدور (گجراتی)''، ''نمی اور روشنی (مراٹھی)''، ''روی (ملیالم) ''اور'' دوسرا چھٹکا (ہندی) شامل ہیں۔

پروفیسر انوارالدین ان کہانیوں کا تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کہانیاں خود ان کی اپنی زبان میں ادبی قدر و قیمت اور فنی معیار کے لحاظ سے کسی مقام اور مرتبے کی حامل ہیں،لیکن ان کے ترجمے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ان میں سستے رومان اور غیر حقیقی تصورات کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور سنجیدہ مسائل کو برتا گیا ہے۔''

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	62	46-47	پروفیسر یونس اگاسکر	افسانے کا عصری منظر نامہ اور ''تعبیر''	2000	جنوری	5

''تعبیر''، معین الدین جینا بڑے کا افسانوی مجموعہ ہے، جو 1999ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں جملہ دس افسانے شامل ہیں۔ مذکورہ مضمون میں پروفیسر یونس اگاسکر نے تعبیر میں شامل افسانوں کا عصری منظر نامے کے تحت جائزہ لیا ہے۔

پروفیسر یونس اگاسکر کے مطابق جینا بڑے صاحب اپنے افسانوں میں افراد کے حوالے سے اجتماع کی عکاسی کرتے ہیں اسی لیے ان کی کہانیوں کو تہذیبی حوالوں کے بغیر سمجھنا دشوار ہے۔ ان افسانوں میں تصوف اور بھکتی، اسلامی، ہندو اور بودھ روایات کی تلاش بھی شامل ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	62	48-52	انور قمر	''تعبیر'' اور ہم عصر اردو افسانہ	2000	جنوری	6

مذکورہ مضمون میں انور قمر نے افسانوی مجموعے ''تعبیر'' میں شامل سارے افسانوں کا الگ الگ تجزیہ پیش کیا ہے۔ مضمون نگار نے ہر افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے افسانے کی عصری معنویت کو اجاگر کیا ہے۔

انور قمر نے اس مضمون میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جینا بڑے کے افسانے موضوعات اور فن دونوں سطح پر نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں نفسیات کی پراسرار کیفیات بھی ان کے فن کے دائرے میں شامل ہیں اور زندگی کا مابعدالطبیعیاتی رخ ان کے اسلوب اور فکر سے روشن ہے۔ ''تعبیر'' کی اشاعت نے اردو ادب کو ایک نئی افسانوی جہت سے آشنا کیا ہے۔ اس کتاب نے ہم عصر افسانوی منظر نامے کو مثبت طور پر بدل دیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
7	جنوری	2000	تعبیر	ندافاضلی	53-55	62	01

ندا فاضلی نے اس مضمون میں معین الدین جینا بڑے کے افسانوی مجموعے ''تعبیر'' میں شامل تمام افسانوں کا بہت خوبصورتی سے تبصرہ کیا ہے۔ افسانوں کے تبصرے سے پہلے جن موضوعات پر معین الدین جینا بڑے نے افسانے قلمبند کیے ہیں ان کا پس منظر بھی ندا فاضلی نے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو کے بڑے افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ معین الدین جینا بڑے کا اسلوب راجندر سنگھ بیدی کے قریب ہے۔

اس مضمون میں ندا فاضلی کا یہ بھی کہنا ہے کہ معین الدین جینا بڑے نے اپنی کہانیوں کی پہلی کتاب ''تعبیر'' میں جن دس کہانیوں کو شامل کیا ہے، ان کے تعلق سے قارئین کی اپنی پسند ناپسند ہو سکتی ہے۔ ان میں سے کسی کو کوئی اچھی کوئی بہت اچھی لگ سکتی ہے۔ کہیں علامتوں اور استعاروں کے الجھاؤ کے سبب کہانی کار اور قاری کا رشتہ الجھا ہوا محسوس ہوتا ہو یا کسی کو کسی کہانی میں اختصار کی ضرورت محسوس ہوتی ہو، لیکن جو ایک وصف ان کہانیوں میں مشترک ہے وہ اپنی سوچ اور تجربہ پر انحصار اور اس کا شخصی اظہار ہے۔

اس مضمون کا اختتام ندا فاضلی نے معین الدین جینا بڑے ہی کے جملے ''واقعہ ہر شخص بیان کر سکتا ہے، ہر شخص کہانی نہیں سنا سکتا'' پر ختم کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''تعبیر'' ایک سوچتے ہوئے ذہن اور باخبر قلم کی کاوش ہے، جس کا ادبی دنیا میں متوقع استقبال ہونا چاہیے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	62	56-58	محافظ حیدر	''تعبیر'' پر ایک نظر	2000	جنوری	8

محافظ حیدر نے اس مضمون میں معین الدین جینا بڑے کے افسانوی مجموعے ''تعبیر'' کے حوالے سے عصری منظر نامے کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ''عصری افسانہ حقیقت کا عکاس ہوتا ہے۔'' ان کا کہنا ہے کہ اردو کے عصری افسانے کا منظر بہتات ہونے کے باوجود مایوس کن نہیں ہے۔

محافظ حیدر نے معین الدین جینا بڑے کے افسانوی مجموعے کا ابتدا تا آخر تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے کتاب میں شامل ''حرف آغاز'' کے عنوان سے شامل دیباچے کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔اس کے بعد ''تعبیر'' میں شامل کئی افسانوں کا مختصراً ذکر کیا ہے، جس میں ''رنگ ماسٹر''، گیت، گھات اور گرجا گھر''، ''ناستک''، ''تعبیر'' برسورام دھڑا کے سے'' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔

ان افسانوں کے حوالوں سے محافظ حیدر نے عصر حاضر کے تمام موضوعات مثلاً فرقہ واریت، دہشت گردی، حسن پرستی، اقلیتی مسائل، جنسی استحصال وغیرہ پر بہت باریک بینی سے بات کی ہے۔

آخر میں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ طوالت سے گریز کرتے ہوئے میں دوسرے افسانوں پر اظہار خیال نہیں کروں گا۔ مذکورہ بالا چند افسانوں کی مثالوں سے معین الدین جینا بڑے کی افسانہ نگاری پر اتنی روشنی پڑ جاتی ہے کہ ان کی صلاحیت اور قابلیت کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور عصری حسیت کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	62	59- 61	پرول بھردواج	''تعبیر''زندگی کی تلاش	2000	جنوری	9

پرول بھردواج نے اپنے مضمون ''تعبیر زندگی کی تلاش'' کی ابتدا ''زندگی ڈھل کر کہانی بن جاتی ہے........ کہانی زندگی کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔'' جملے سے کیا ہے۔اس مفہوم میں ''تعبیر'' زندگی کی ستائش اوراس کا جشن یا بہ الفاظ دیگر اس عظیم خواب کی تعبیر جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔

مضمون نے نگار نے معین الدین جینابڑے کے ہر افسانے کو زندگی سے جوڑ کر دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''حرف آغاز'' میں افسانہ نگار ہمارے سامنے ایک سماجی نقاد کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔اس لیے افسانہ نگار اپنے تمام افسانے میں تنقیدی نظریے سے کام لیتا ہے۔

انہوں نے اپنی تمام کہانیوں میں سماجی، سیاسی، تہذیبی اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تمام بڑے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے، جس میں بابری مسجد انہدام جیسا بڑا مسئلہ بھی شامل ہے۔

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ افسانہ نگار زندگی اور فن کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے بالکل خلاف ہے، فی الواقعہ ان کی نظر میں وہ باہم وگر پیچ ہوئے ہیں۔، جو فن پارے کو دھڑکن عطا کرتی ہے اور اس طرح اپنے اندر تخلیق کا سامان رکھتی ہے۔تو پھر یہ ایک روحانی جستجو ہے، جو ایک سماجی ثقافتی اور سیاسی تجربہ ہے۔

آخر میں مضمون نگار اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان کہانیوں کا محض سطحی مطالعہ عام قاری کو الجھن میں ڈال سکتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے زندگی الجھن میں ڈالتی ہے۔جب مختلف پرتیں کھلتی ہیں تو ہم پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
06	62	60-61	ڈاکٹر وزیر آغا	مظہر الزماں خاں کے نئے افسانے	2000	جون	10

مظہر الزماں خاں دور جدید کے عہد ساز افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے بے شمار علامتی اور تجریدی افسانے لکھے ہیں۔لیکن وزیر آغا نے اس مضمون میں ان کے نئے افسانے کو موضوع بنایا ہے۔ نئے افسانے سے ان کی مراد یہ ہے کہ ان کے وہ افسانے جو مابعد جدیدیت رجحان کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں ان کا اسلوب پہلے کے افسانوں سے جدا ہے۔

مظہر الزماں خاں کے نئے افسانے مختصر ضرور ہیں، لیکن اپنے آپ میں یہ ایک وسیع وسعت لیے ہوئے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے نئے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے اس مضمون میں ''گلدار''، ''نجات''،''آخری تماشہ''،''لفٹ''،''فیصلوں پہ لہو''،''نئی زمین کے پودے''،''آسیب''،''آخری مقدمہ''، ''آئینہ پہ زخم''،''زمین اے زمین'' وغیرہ افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مظہر الزماں خاں کو نئے اور منفرد اسلوب کا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔

مضمون کے آخر میں ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مظہر الزماں خاں کے افسانوں میں کم جگہ میں زیادہ سامان سجا لینے کا شعور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پہلے کے افسانوں سے زیادہ اثر انداز ہیں اور قاری کو زیادہ متاثر بھی کرتے ہیں۔ یہی فن ان کو ممتاز اور منفرد بھی بناتا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
11	جون	2000	بابِ افسانہ پر مظہر الزماں خاں کی دستکیں	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	62-64	62	06

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اس مضمون میں پہلے جدید افسانے کی خامی اور خوبی کا ذکر کرتے ہوئے جدید افسانے کے بارے میں چند پہلو کا ذکر کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ناقدین جدید افسانے کے بارے میں کہتے ہیں کہ جدید افسانے میں افسانوی پن نہیں ہے۔جدید افسانہ مبہم ہے۔جدید افسانہ عصری حسیت سے عاری ہے۔جدید افسانہ تجریدی ہے۔جدید افسانہ بھول بھلیاں ہے۔جدید افسانہ تو افسانہ ہی کہاں ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ جدیدیت کے سارے افسانے اسی طرح کے نہیں ہیں بلکہ کچھ افسانے ایسے بھی ہیں جن میں افسانوی پن ہے۔جو ابہام یا ایہام کا شکار نہیں ہیں۔جو عصری حسیت کے حامل ہیں۔تجرید سے جن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔بھول بھلیا کا جن میں ذکر نہیں ہے اور وہ ٹھیٹ افسانہ ہیں ، موضوع ،زبان و بیان، لہجہ واسلوب ہر اعتبار سے۔ایسے افسانہ نگاروں اور افسانوں میں مظہر الزماں خاں کے افسانے ہمیشہ دیدہ ودل کو متوجہ کرتے رہتے ہیں۔

آخر میں ان کا کہنا ہے کہ اسی اسلوب کے سلسلے میں عرض ہے کہ مظہر الزماں خاں کے ہاں بعض نہایت خوبصورت اور فکر انگیز جملے ملتے ہیں جو ایک طرف اظہار پر ان کی قدرت کی شہادت دیتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے مسائل پر ان کی گہری نظر کی علامت بھی ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
08,09	62	60-74	امین راحت چغتائی	بارِ ہستی۔ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے نئے افسانے	2000	اگست، ستمبر	12

نگار سجاد ظہیر اردو کے معروف فکشن نگار سجاد ظہیر کی بڑی بیٹی ہیں ۔ان کا اصل میدان اسلامی تاریخ و تحقیق ہے،لیکن انہوں نے افسانے بھی قلم بند کیے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ پہلے مجموعے کا عنوان ''دست قاتل''اور دوسرے کا عنوان ''بار ہستی'' ہے۔

امین راحت چغتائی نے اس مضمون میں نگار سجاد ظہیر کے نئے افسانوں یعنی کہ ''بار ہستی'' کے تمام افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ان افسانوں کے تجزیے سے پہلے امین راحت چغتائی نے ان افسانوں کے پس پردہ سماجی و سیاسی حالات اور موضوعات کا جائزہ لیا ہے اس کے بعد''بار ہستی'' میں شامل ایک ایک افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔

اس مجموعے میں پہلا افسانہ'' گلابو'' کے عنوان سے شامل ہے، جو ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔اس کے بعد ''کتے کی دم''،''اندھیرے''،''اجنبی''،''جھوٹھا''،''چھتری گلی''،''بالکونی''،''اگلے برس''،''کوڑیالے سانپ''،سائبان''،''جال''وغیرہ افسانے شامل ہیں۔

امین راحت چغتائی آخر میں ان تمام افسانوں کے تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ''بار ہستی'' بحیثیت مجموعی تنوع اور رنگارنگی سے متصف افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں زندگی کی وہ صداقتیں جلوہ گر ہیں ، جو بادی النظری میں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔اس مجموعے کے بیش تر کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں،جنہیں ڈاکٹر نگار نے قریب سے دیکھا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	63	38-40	قدیر زماں	میں اور میرا فن	2001	جنوری	13

قدیر زماں کا شمار حیدر آباد کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اس مضمون میں پہلے اپنی حالات زندگی یعنی پیدائش، پرورش، تعلیم و تربیت کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد مطالعہ ادب میں شوق اور لکھنے کی ابتدا کے بارے میں ذکر کیا ہے۔

مضمون کے آخر میں اپنی تخلیقات کی خوبی وخامی کے بارے میں مختصراً بیان کیا ہے۔اپنی تحریر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ''میری تحریریں سپاٹ نہیں ہیں۔ایسا قاری جو کسی یقین کو پا چکا ہو اور جس نے انسانی زندگی کی ہمہ جہتی پر غور وفکر نہ کیا ہو وہ میری تخلیقات کو آسانی سے سمجھ نہیں پائے گا۔''

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	63	41-42	مضطر مجاز	قدیر زماں ایک فن کار	2001	جنوری	14

مضطر مجاز کا یہ مضمون قدیر زماں کی فن کاری کا بھر پور احاطہ کرتا ہے۔انھوں نے مضمون کی ابتدا ان کے پیدائشی گاؤں سے کی ہے، جو حیدر آباد کا ایک چھوٹا سا گاؤں ''گمبیھر پور'' ہے۔اس کے بعد انھوں نے قدیر زماں کی تعلیم و تربیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی عملی اور ادبی زندگی کا ذکر کیا ہے۔

مضطر مجاز ان کے تخلیقی سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے بیک وقت افسانے، ڈرامے، اقبالیات کے علاوہ انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے ادب کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ان کے افسانوں کے دو مجموعے ''رات کا سفر'' اور ''ادھورا سفر'' ڈراموں کے دو مجموعے ''ماورا'' اور ''پنجرے کا آدمی'' شائع ہو چکے ہیں۔

مضمون کے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کی اتنی ساری مصروفیات و مشغولیات کے ساتھ تصنیفی و تالیفی کام کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدیر زماں کو بھی آخر وہی دن کے ۲۴ گھنٹے، مہینے کے تیس دن اور سال کے ۳۶۵ دن ملے ہیں۔وہ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	63	43-44	بیگ احساس	ادھوراسفر	2001	جنوری	15

''ادھوراسفر'' قدیر زماں کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے، جو 1993ء میں منظر عام پر آیا۔ بیگ احساس نے قدیر زماں کے افسانوی مجموعے ''ادھوراسفر'' کے افسانوں کا تجزیہ کرنے سے پہلے ان کی افسانہ نگاری کا ذکر کیا ہے۔ قدیر زماں کا پہلا افسانہ حیدرآباد سے نکلنے والے رسالے ''صبا'' میں ''جہان گزراں'' کے عنوان سے 1963ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے ''ادھوراسفر'' میں شامل تمام افسانوں کا مختصراً تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس مجموعے میں بیس کہانیاں شامل ہیں، جن میں کچھ کہانیاں موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے بڑا تنوع رکھتی ہیں۔ ان کی ساری کہانیاں حقیقت سے قریب ہیں اور ہر کہانی میں زندگی کی کسی نہ کسی سچائی کو پیش کیا گیا ہے۔

بیگ احساس کے مطابق ان کے اکثر افسانوں کا ٹریٹمنٹ بہت عمدہ ہے۔ شعور اور لاشعور کی کشمکش کو قدیر زماں نے بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے اور یہی ٹریٹمنٹ اسے عام افسانوں سے مختلف اور منفرد بناتا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	63	45	رام پرکاش راہی	قدیر زماں اور ادھورا سفر	2001	جنوری	16

''قدیر زماں اور ادھوراسفر'' رام پرکاش راہی کا بہت ہی مختصر مضمون ہے، جو صرف ایک صفحے پر لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے افسانوی مجموعے کی خدوخال کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق اس مجموعے کے سرورق پر مغنی تبسم کا ایک کوٹ ہے اور اس کی بیشتر کہانیاں ایک واقعاتی کیفیت کے اظہار سے شروع ہوتی ہیں، جو تخلیق کار کے مشاہداتی اور تجرباتی اندوختے کی دین ہوتی ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	63	46-49	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	قدیر زماں کی افسانہ نگاری	2001	جنوری	17

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا شمار حیدرآباد کے منفرد نقادوں میں ہوتا ہے۔حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔انہوں نے ''قدیر زماں کی افسانہ نگاری'' کے عنوان سے قدیر زماں کی افسانہ نگاری پر ایک بھرپور مضمون قلمبند کیا ہے۔

اس مضمون میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے ان کے دونوں افسانوی مجموعے ''رات کا سفر'' اور ''ادھورا سفر'' دونوں کا جائزہ لیا ہے۔قدیر زماں کا پہلا افسانوی مجموعہ 1967ء میں منظر عام پر آیا،جن میں جملہ 9 افسانے اور دوسرا مجموعہ 1992ء میں منظر عام پر آیا،جن میں جملہ 20 افسانے شامل ہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ان کے افسانوی مجموعے ادھورا سفر کے متعلق لکھتے ہیں کہ قدیر زماں نے ''ادھورا سفر'' کے سرورق کے لیے سعید ابن محمد نقش کی ایک پینٹنگ کا انتخاب کیا ہے،جس میں نیکی اور بدی ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔سرورق کا انتخاب یوں ہی نہیں بلکہ یہ تو قدیر زماں کے بیشتر افسانوں کا مرکزی خیال ہے۔ ان کے مشہور افسانوں میں ''مانس گند''،''ادھورا سفر''،''فریاد''،''جہان گزراں''، ''آوازیں''،''رات کا سفر''،''زیرو آور'' وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔

آخر میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قدیر زماں اپنے افسانوں کی دنیا میں یوں کھو جاتے ہیں کہ زبان و بیان پر کہیں کہیں ان کی توجہ کم ہو جاتی ہے۔ان کا پیرایۂ بیان حلاوت اور شیرینی سے دور ہی ہے۔وہ کھردرے اور سپاٹ پن سے کام لیتے ہیں،جو اس زندگی کی بے رنگی اور اکھڑ پن کی چغلی کھاتا ہے،جو ان کے افسانوں کے مرکزی خیال اور موضوع سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
18	جولائی	2001	فکشن اور زبان کا مسئلہ (ذوقی کی کہانیوں کے آئینے میں)	ایم۔قمر علیگ	15-20	63	07

ایم۔قمر علیگ نے اس مضمون کی ابتدا ذوقی کے ایک جملے ’’فکشن میں زبان کو اولیت نہیں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔‘‘ سے کیا ہے۔

اس مضمون کے پہلے جملے ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ فکشن یا کہانی میں زبان کو اولیت نہیں بلکہ موضوع کو اولیت دی جاتی ہے۔ایم۔قمر علیگ نے پورے مضمون میں ذوقی کی کہانیوں کے حوالے سے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ذوقی ہی کی کہانیوں میں ہی نہیں بلکہ تمام فکشن میں زبان کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

مضمون نگار کا یہ بھی ماننا ہے کہ فکشن اور زبان کے مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے ذوقی ہی کی کہانیوں کو موضوع اس لیے بنایا گیا ہے کہ سب سے زیادہ حملہ ادب کے نقادوں نے ذوقی کی زبان پر کیا ہے۔جب کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ زبان کا معاملہ کبھی بھی یہ نقاد حضرات سنجیدگی سے نہیں لے پائے جسے ذوقی ہمیشہ کہتے آئے ہیں۔

مضمون کے آخر میں مضمون نگار نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مجموعی طور پر اب یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ فکشن کی اپنی زبان ہوتی ہے۔فکشن اپنا لہجہ، اپنا اسلوب خود تلاش کرتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ بھولے بھالے معصوم نقادوں کو جنہیں کہانیوں کا ذرا سا بھی علم نہیں، فکشن کو احتیاط سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ذوقی کی زبان اور اسلوب سمجھنے میں انہیں جس پارکھی نظر اور مطالعے کی ضرورت ہے ابھی ان میں اس کا فقدان ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	64	25-28	بلراج کومل	بیگ احساس کے افسانے-ایک مطالعہ	2002	جنوری	19

بلراج کومل نے اس مضمون میں بیگ احساس کے ان افسانوں کا مطالعہ کیا ہے، جو ان کے دو افسانوی مجموعے ''خوشۂ گندم'' اور ''حنظل'' میں شامل ہیں۔ اس میں انہوں نے بیگ احساس کی پہلی کہانی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ ''تیرگی کا سفر''، ''اندھیری دھوپ''، ''ریت کا سمندر''، ''گندی''، ''آ گہی کا سمندر'' اور ''خوشۂ گندم'' بیگ احساس کے پہلے مجموعے ''خوشۂ گندم'' کے نمائندہ افسانے ہیں۔

اسی طرح بلراج کومل نے بیگ احساس کے دوسرے افسانوی مجموعے میں شامل ''میوزیکل چیئر''، ''کرفیو''، ''ملبہ''، ''اجنبی اجنبی''، ''بے سورج آسمان''، ''آسمان بھی تماشائی'' اور حنظل'' وغیرہ کو اس مجموعے کا نمائندہ افسانے قرار دیا ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار ان کے دونوں افسانوی مجموعوں کا تقابل کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حنظل میں شامل افسانوں کا خوشۂ گندم کے افسانوں کے انداز کا خاکہ یا مختصر ڈائجسٹ کرنا خاصہ دشوار کام ہے، کیوں کہ یہ افسانے واقعات کا منطقی بیان اگر کرتے بھی ہیں تو کوئی دستاویز تیار نہیں کرتے بلکہ تلاش معنی کے نشیب و فراز کا پر خطر سفر بن جاتے ہیں۔ خوشۂ گندم میں شامل افسانوں میں گوشت پوست کے انسان ہیں، جو کرداروں میں ڈھلنے کے بعد انسانی جبلتوں، سماجی رویوں کی تجسیم بن جاتے ہیں۔ جب کہ حنظل میں یہ کردار کم و بیش بے نام اور زمان و مکان سے آزاد ہونے کے باعث وسیع تر معنوی پرواز سے سرفراز ہوتے ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	64	29-32	پروفیسر مغنی تبسم	بیگ احساس کا افسانوی سفر	2002	جنوری	20

مذکورہ مضمون میں پروفیسر مغنی تبسم نے بیگ احساس کے افسانوی سفر کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ بیگ احساس نے 1971ء میں افسانے کی دنیا میں قدم رکھا۔ان کا پہلا افسانہ 'سراب' کے عنوان سے دہلی سے نکلنے والے رسالے 'بانو' میں چھپا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خوشئہ گندم'' کے عنوان سے 1979ء میں، دوسرا ''حنظل'' کے عنوان سے 1993ء میں منظرعام پر آیا۔ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''دخمہ'' کے عنوان سے 2015ء میں منظرعام پر آیا۔اس لیے اس مجموعے کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے۔

مغنی تبسم کہتے ہیں کہ بیگ احساس کے افسانوں میں موضوع کے ساتھ فن کارانہ انصاف کی ایک پر خلوص کاوش ملتی ہے۔ بیگ احساس نے تمثیلی اور تشبیہی اظہار کو اپنے اسلوب میں نمایا جگہ دی ہے۔مثال کے طور پر ان کی مشہور کہانی ''سوا نیزے پر سورج'' میں انہوں نے تمثیل نگاری کا نیا پیرایہ اختیار کیا ہے۔اس کہانی میں بیانیہ اور تمثیل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اسی طرح ''پناہ گاہ کی تلاش''، ''ملبہ''، ''کرفیو'' اور ''برزخ'' میں بھی تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہے۔

بیگ احساس نے افسانوں میں تمثیل کے ساتھ ساتھ تشبیہ اور علامت کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ اس کے لیے قرآن، ہندو دیومالا اور داستانوں سے کردار مستعار لے کر انہیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے افسانوں میں پرویا گیا ہے۔

مضمون کے آخر میں مغنی تبسم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سادہ تمثیل سے علامت تک بیگ احساس نے اپنا تخلیقی سفر کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو کہانی جو ایک موڑ پر آ کر رک سی گئی ہے اسے نئی سمت اور رفتار دینے میں بیگ احساس اہم رول ادا کریں گے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	64	33-34	یوسف ناظم	حنظل	2002	جنوری	21

اس مضمون میں بیگ احساس کے دوسرے افسانوی مجموعے ''حنظل'' میں شامل افسانوں کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یوسف ناظم نے افسانوں کا جائزہ لینے سے پہلے افسانوں کے موضوعات کے پس پردہ کہانیوں کو بیان کیا ہے۔ پھر الگ الگ افسانوں کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔

مضمون کے آخر میں یوسف ناظم نے کتاب کی ظاہری ساخت، پبلیشر اور کتاب میں شامل مصنف کی تصویر کا بھی ذکر کیا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	64	35-38	ڈاکر خالد سعید	حنظل ایک مطالعہ	2002	جنوری	22

''حنظل'' بیگ احساس کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے اور اسی نام سے اس میں ایک افسانہ بھی شامل ہیں۔ مضمون کے عنوان سے ایسا لگتا ہے کہ مضمون نگار نے اس میں ان کے افسانے ''حنظل'' کا تجزیہ کیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے ۔اس مضمون میں افسانوی مجموعے ''حنظل'' کے تمام افسانوں کا الگ الگ تجزیہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر خالد سعید نے مضمون کے ابتدا میں ہی کئی افسانوں کا ذکر کیا ہے، جس میں ''اجنبی اجنبی''، ''میوزیکل چیئر''، ''پناہ گاہ کی تلاش'' وغیرہ شامل ہیں۔ باقی دوسرے افسانوں کو بھی انہوں نے اپنے مضمون میں جگہ دی ہے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کے افسانے علامتی اور تجریدی نوعیت کے ہیں اور علامتی اور تجریدی نوعیت کے افسانے اس دور کے بہترین افسانے مانے جاتے تھے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
23	جنوری	2004	سید محمد اشرف کا فکشن: فکری وفنی تناظر	ڈاکٹر صغیر افراہیم	13-20	66	01

اس مضمون میں ڈاکٹر صغیر افراہیم نے سید محمد اشرف کے فکشن کا فکری وفنی تناظر میں جائزہ لیا ہے۔ مضمون نگار نے افسانوں کا تجزیہ کرنے سے پہلے افسانہ نگار کا اوران کے پورے فکشن کا تعارف کرایا ہے۔

سید محمد اشرف کا اردو افسانے میں مقام متعین ہو چکا ہے۔ان کے اب تک دو افسانوی مجموعے ''ڈار سے بچھڑے'' اور ''بادِصبا کا انتظار'' شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ ایک ناول ''نمبر دار کا نیلا'' اور ایک ناولٹ ''میرا من کا قصہ سنو'' بھی لکھا ہے۔ان کی کچھ کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔افسانوی مجموعہ ''بادصبا کا انتظار'' پرساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔

سید محمد اشرف نے اپنی ابتدائی کہانیوں کا ڈھانچا زیادہ تر علامتی طرز پر رکھا ہے۔ استعاروں اور علامتوں کے درمیان سے اپنے لیے حقیقت نگاری کی راہیں ہموار کی ہیں۔انہوں نے اپنے زمانے کے بہت سے سنجیدہ مسائل پر غور کیا اوران کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔جس میں قدروں کا ٹوٹ کے بکھرنا سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔

سید محمد اشرف نے اپنی کہانیوں کے بیان میں نہایت ہی سادہ اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ان کی کہانیوں میں صاف ستھری زبان دیکھنے کو ملتی ہے۔انہوں نے نہایت سادہ،آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ سید محمد اشرف کا افسانوی سفر جاری ہے۔ مذکورہ بالا تمام خصوصیات اور منفرد انداز و بیان کی بنا پر موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں وہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
24	اکتوبر	2004	اشفاق احمد	مرزا حامد بیگ	3-4	66	10

اس مضمون میں مرزا حامد بیگ نے معروف افسانہ نگار اشفاق احمد اور ان کی کتابوں سے تعارف کروایا ہے۔مرزا حامد بیگ کے اس مضمون کے مطابق اشفاق احمد ۲۲/اگست ۱۹۲۵ء کو فیروز پور مشرقی پنجاب، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ان کا بچپن اور لڑکپن فیروز پور ہی میں گزرا۔قیام پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے۔گھر کے حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے جیسے تیسے تعلیم حاصل کی اور ملازمت حاصل کر لی۔ان کی شادی اردو کی مشہور ناول نگار بانو قدسیہ سے ہوئی۔

اشفاق احمد کی جملہ ۲۸ کتابیں ہیں،جن میں سے تین افسانوی مجموعے ہیں۔پہلا افسانوی مجموعہ ''ایک محبت سو افسانے'' کے عنوان سے سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا۔اس میں کل تیرہ افسانے شامل ہیں۔

ان کا دوسرا مجموعہ ''اجلے پھول'' کے عنوان سے بک لینڈ لاہور نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔اس میں کل آٹھ افسانے شامل ہیں۔

تیسرا افسانوی مجموعہ ''سفر مینا'' کے عنوان سے سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا اور اس مجموعے میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔

اس مضمون کے مطابق اشفاق احمد نے ۱۹۸۸ء تک کل ۱۳۵ افسانے قلمبند کیے۔۱۳۲ افسانے ان تین مجموعوں میں یکجا کر دیے گئے ہیں جب کہ تین افسانے ان مجموعوں میں شامل نہیں ہو پائے ہیں۔وہ مختلف رسالو میں محفوظ ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
25	اکتوبر	2004	نئی نسل اور کرشن چندر کی افسانوی روایت کا مسئلہ	اقبال مجید	51-54	66	10

اقبال مجید نے اس مضمون میں کرشن چندر کے حوالے سے ایک نئی بحث کو اٹھایا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ کرشن چندر اپنے کو لکھنے والا جانور کہتے تھے۔اس لیے وہ مسلسل لکھتے رہتے تھے۔اتنی تیز رفتاری سے لکھتے تھے کہ انہیں پلٹ کر دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ہوتی تھی۔اس لیے اگر کرشن چندر کی پوری تخلیقات کو آج کے نوجوان کے سامنے رکھ دیا جائے تو آج کا نوجوان قاری ان میں سے اکثر تخلیقات کو کرشن چندر کی تخلیق کو ماننے سے انکار بھی کرسکتا ہے۔

اقبال مجید نے اسی بحث کو اس مضمون میں اٹھایا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کرشن چندر کے بعد بھی کہانی لکھنے والے آئے۔انہوں نے خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے اپنی نگاہ کو نئی ترتیب دی۔انہوں نے بھی کرشن چندر کی طرح نہیں لکھا بلکہ اپنی طرح لکھا،مگر کرشن چندر نے انہیں فن کار نہیں مانا۔

کرشن چندر کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر تقریباً سو کتابیں ہیں۔نئے ناقد کے لیے کرشن شناسی کے باب میں ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ کرشن چندر کے فن کی خوبیوں کا سراغ لگا کر اس کے فن سے نتیجہ اور بامعنی سلیقہ پیدا کرنے میں نئے فکشن نگار کی مدد کریں کیوں کہ اب ہمارے افسانہ نگاروں کو فکشن کی روایات کے محل میں آنکھ بند کر دینے سے جو ٹوٹ پھوٹ اور انہدام ہوا ہے اور اس سے فکشن کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
11	66	23-25	ڈاکٹر صغیر افراہیم	آزادی کے بعد اردو افسانے کی صورت حال	2004	نومبر	26

ڈاکٹر صغیر افراہیم نے اس مضمون میں آزادی کے بعد اردو افسانے کی صورت حال کو بیان کیا ہے۔ مضمونگار نے آزادی کے بعد کی افسانوی صورت حال کو بیان کرنے کے لیے آزادی سے پہلے کی افسانوی صورت حال کا سہارا لیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ آج کی کہانی کل کی کہانی سے بہت بدل گئی ہے، اس میں شک نہیں۔ اس میں تبدیلی کہانی لکھنے کے ڈھنگ میں اتنی نہیں ہے جتنی کہانی کے موضوع اور نقطۂ نگاہ میں۔ کبھی کہانی کارکو دلچسپ اور انوکھے پن کی تلاش رہتی تھی، لیکن آج سوال تلاش کا نہیں شناخت کا ہے۔ آج کا ادیب زندگی کی سماجی اور ذاتی سطح کو پرکھ کر اپنی کہانی میں اس کا نتیجہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہانی کے متعلق نیا نظریہ ہے، جس کی وجہ سے کہانی کی پسندیدگی کی سمت بھی بدل گئی ہے اور جہاں سے ہم کہانی لکھنے کی تحریک لیتے ہیں وہ سوتے بھی وسیع ہو گئے ہیں۔

آزادی کے پہلے جو موضوعات افسانہ نگاروں کے لیے بہت اہم تھے وہی موضوع آزادی کے بعد افسانہ نگاروں کے لیے بے سود ہو گئے۔ اب ان کے پاس افسانے کے بہت سے نئے موضوعات آ گئے تھے، مثلاً ہجرت، قتل و غارت گری، جنسی استحصال وغیرہ۔ اس طرح کے موضوعات آزادی کے پہلے نہیں ملتے۔ اس لیے مضمون نگار نے افسانوں کے حوالے سے آزادی کے بعد کی صورت حال کو بیان کیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
27	فروری	2005	کرشن چندر: شخصیت اور فن	پروفیسر اشرف رفیع	14-17	67	02

''کرشن چندر: شخصیت اور فن'' پروفیسر بیگ احساس صاحب کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے۔ انہوں نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب حالات زندگی، دوسرا شخصیت، تیسرا افسانے کا پہلا دور 1936 تا 1945 اور چوتھا افسانے کا دوسرا دور 1945 تا 1977 کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ آخر میں انہوں نے افسانوی مجموعے اور افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ ناول اور ڈرامے وغیرہ کی فہرست درج کی ہے، جس کا عنوان انہوں نے فہرست تصانیف درج کیا ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب میں مختلف ذیلی ابواب مثلاً پیدائش، افراد خاندان، بچپن، تعلیم، ابتدائی نظریات، ادبی زندگی، ازدواجی زندگی، اسلام قبول کرنا، ازدواج ثانی، سماجی سرگرمیاں، اعزازات و حادثات، سیاسی نظریات، بیماری اور اخری سفر اور آخری رسومات کے تحت کرشن چندر کی زندگی پر بہت باریک بینی سے نظر ڈالتے ہوئے اس باب کو مکمل کیا ہے۔

دوسرے باب ''شخصیت'' میں بھی مختلف ذیلی ابواب مثلاً خدوخال، بچپن، جوانی، لباس، نفاست، غذا، عملی زندگی، آمدنی، کام سے دلچسپی، پبلشروں سے تعلقات، گھریلو ذمے داریاں، وطن سے محبت، حالات سے لڑنے کی قوت، روشن ضمیری، خوشی وغم کا امتزاج اور آخری خواہش کے تحت ان کی پوری شخصیت کو بہت ہی نفیس اور آسان زبان میں قلم بند کیا ہے۔

تیسرے اور چوتھے باب میں انہوں نے ان کی پوری افسانہ نگاری کو دوحصوں 1936 تا 1945 اور 1945 تا 1977 میں تقسیم کر کے ان کی افسانہ نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
28	دسمبر	2005	سلام بن رزاق: فسادات اور فرقہ واریت کے افسانے	تسنیم فاطمہ	24-26	67	12

اس مضمون میں تسنیم فاطمہ نے سلام بن رزاق کے ان افسانوں کا ذکر کیا ہے، جن میں فسادات اور فرقہ واریت کو موضوع بنایا گیا ہے۔فرقہ واریت کے موضوع سے ابتدائی دور میں سلام بن رزاق کے یہاں افسانے نہیں ملتے، لیکن بعد کے کئی افسانوں میں انہوں نے فرقہ واریت اور فساد کو موضوع بنایا ہے، جس میں ''اندیشہ''، ''آندھی میں چراغ''، ''باہم''، ''چادر''، ''زمین''، ''چہرہ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تسنیم فاطمہ نے مذکورہ بالا تمام افسانوں کا بہت اچھے طریقے سے تجزیہ پیش کیا ہے۔انہوں نے بتایا ہے کہ ''اندیشہ'' میں براہ راست فرقہ واریت کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، لیکن فساد کا خوف پورے افسانے میں چھایا ہوا ہے۔افسانہ ''آندھی میں چراغ'' کا پلاٹ فساد کے اردگرد گھومتا رہتا ہے۔افسانہ ''چادر'' میں ودیا چرن اور انور کے حوالے سے فرقہ وارانہ زندگی کے نشیب وفراز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

افسانہ ''چہرہ'' اور ''زمین'' میں بھی فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر ہے۔دوستی کی دیوار کیا ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ جائے گی۔اس جذباتی سوال کو فرقہ وارانہ مسئلے سے جوڑ کر سلام بن رزاق نے افسانہ ''زمین'' میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔افسانہ ''باہم'' میں بھی سلام بن رزاق نے بابری مسجد کے انہدام کی اطلاع دی ہے۔

تسنیم فاطمہ مضمون کے آخر میں اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ سلام بن رزاق بہت پختہ سماجی اور سیاسی شعور رکھتے ہیں اس لیے ان کے افسانے فسادات اور فرقہ واریت کے سوالوں پر نہایت سوجھ بوجھ اور فنی پختگی کے ساتھ لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ان کے ہم عصروں میں شاید ہی کوئی ہو جس کے پاس فرقہ واریت کے تعلق سے اتنے اچھے افسانے خاصی تعداد میں موجود ہوں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
29	دسمبر	2005	اردو کے افسانوی ادب میں مذہبی عناصر	ڈاکٹر قاضی حبیب احمد	27-31	67	12

اس مضمون میں ڈاکٹر قاضی حبیب نے اردو کے افسانوی ادب میں مذہبی عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے سب رس کو فکشن کا حصہ بتاتے ہوئے اس میں مذہبی عناصر کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد نذیر احمد کے ناولوں میں بھی مذہبی عناصر کو دکھایا ہے۔ڈاکٹر قاضی حبیب کے مطابق ''مراۃ العروس''،ابن الوقت''،''رویائے صادقہ''میں بھی مذہبی عناصر سے کام لیا گیا ہے۔

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ عبدالحلیم شرر کے تقریباً سبھی ناول مذہبی عناصر سے بھرے ہوئے ہیں۔شرر نے اپنے ناولوں میں مذہب عظمت اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کا شاندار تذکرہ کیا ہے۔''فردوس بریں'' شرر کا شاہکار ناول ہے۔اس ناول کو انہوں نے خالص مذہبی روایات سے مکمل کیا ہے۔

محمد ہادی رسوا سے اردو ناول کا ایک ایسا دور شروع ہوتا ہے،جس پر حقیقت نگاری کی گہری چھاپ موجود ہے۔یہاں سے فن کو فروغ حاصل ہوا۔پھر بھی ان کے ناولوں میں اسلامی کردار اور اسلامی افکار و نظریات موجود ہیں۔''امراؤ جان ادا''میں بھی تین قسم کے مولوی صاحبان کا ذکر آتا ہے،جن میں سے ہر ایک ایک الگ قسم کی اخلاقیات ہے۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ مذہب چونکہ لوگوں کی مقبول قدر ہے تو اس کو ہمارے افسانوی ادب کا موضوع بننا چاہیے۔ناول کے ذریعے مذہبی ماحول، مذہب کو نئے انداز سے ہم اپنے افسانوی ادب میں شامل کر سکتے ہیں اور یہ نیا تجربہ یقیناً ادب کو عوام سے قریب کرنے اور زبان و ادب کی نشو ونما اور احیا میں مددگار ثابت ہوگا۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
30	مارچ	2006	ذوقی کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر عطیہ رئیس	32-33	68	03

عہد حاضر کی افسانہ نگاری میں ایک اہم نام مشرف عالم ذوقی کا ہے۔ وہ اس عہد کے ایسے افسانہ نگار ہیں، جن کے یہاں انسانی قدروں کا احترام بھی ہے اور فنی قدروں کا پاس بھی ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں قلم کے زور سے بھرپور سماجی مظاہرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر عطیہ رئیس نے اس مضمون میں مشرف عالم ذوقی کی افسانہ نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ذوقی کے افسانوں کے موضوعات کے ساتھ ساتھ ذوقی کی فن کاری کا بھی جزئیات نگاری کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے۔

عطیہ رئیس کے مطابق ذوقی کے فن کا سب سے نمایاں پہلوان کے افسانوں کا ٹریٹ منٹ ہے، جو مختصر اور مجمل ہونے کے ساتھ ساتھ خود کفیل اور معنی خیز ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ذوقی نے افسانہ نگاری کے ذیل میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور کہانی کے اکہرے پن میں تہہ داری پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات ہی نہیں بلکہ تکنیک کی سطح پر بھی وسعت پیدا کی ہے۔

مضمون کے آخر میں ڈاکٹر عطیہ رئیس اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ مشرف عالم ذوقی کے افسانوں میں فن کی دھمک ابتدا تا آخر سنائی دیتی ہے۔ اسلوب کی کاٹ، موضوع کا انتخاب، کرداروں کے اطوار، کرداروں کے مکالمے، تکنیک اور تجربے کا اچھوتا پن ذوقی کے افسانوی کرافٹ کو تقویت عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرف عالم ذوقی عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں منفرد پہچان رکھتے ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
31	جولائی	2006	باہمی اتحاد کی علامت ۔۔۔۔پریم چند	صغیر افراہیم	18-21	68	07

پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند کا ذہنی سفر انیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی سے شروع ہو کر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے وسط میں ختم ہوتا ہے۔ یہ سفر تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔اس نصف صدی میں ہندوستان کی قومی وسیاسی اور اقتصادی زندگی میں زبردست انقلاب رونما ہوا ہے اور متضاد حالات و کیفیات کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ رہا ہے۔

پریم چند نے جب اپنا ادبی سفر شروع کیا تو اُس دور کا ہندوستان اصلاحی اور انقلابی سرگرمیوں میں سرگرداں ہونے کے باوجود متعدد طرح کے تضادات کا شکار تھا۔مشرق اور مغرب کے درمیان فیصلہ کرنا اُن کے لیے بہت کٹھن تھا کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے اس معاشی بدحالی سے باہر نکالنے کے لیے پریم چند نے ادب کا سہارا لیا۔اس لیے اُن کے افسانوں اور ناولوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ظلم کرنے والوں کے بجائے مظلوموں کا ساتھ دیا،استحصال کرنے والوں کے بجائے استحصال کیے جانے والوں اور حاکم کے بجائے محکوم کے ساتھ اور خاص کر زمیندار اور کسان کی لڑائی میں پریم چند کسانوں کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں جس کا بخوبی اندازہ اُن کی تخلیقات سے لگایا جاسکتا ہے۔

صغیر افراہیم نے انہیں موضوعات کو اس مضمون میں زیر بحث لایا ہے اور ان کے افسانوں اور ناولوں کے اقتباسات سے یہ دکھایا ہے کہ پریم چند نے اپنی تخلیقات سے باہمی اتحاد کی طرف بہت زور دیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
32	جولائی	2006	۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانوی ادب کے موضوعات اور اسالیب	نورالحسنین	22-25	68	07

1960ء کے بعد اردو افسانوی ادب میں موضوعات اور فن دونوں سطحوں پر کافی تبدیلی آئی ہے۔ اس دور کے افسانوں کو جدیدیت کے نام سے منسوب کیا گیا۔ایک طرف جدیدیت کے تحت لکھے گئے افسانوں میں علامت اور تجریدیت کا خوب استعمال کیا تو دوسری طرف نت نئے فنی تجربات بھی کیے گئے اور زبان و بیان اور اسلوب میں بھی بہت تبدیلی نظر آئی۔

نورالحسنین کا یہ مضمون انہیں ساری باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔نورالحسنین خود 1960ء کے بعد افسانوی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اس دور کے افسانوں کے موضوعات اور اسلوب پر اپنے تجربے کی روشنی میں بہت ہی خوبصورتی سے نظر ڈالی ہے۔

نورالحسنین کے اس مضمون کے مطابق 1960ء کے بعد افسانوی ادب میں موضوع اور مواد دونوں سطحوں پر تنوع پیدا ہوا ہے۔ تجربوں اور تکنیکوں کے نئے نئے روپ بھی سامنے آئے ہیں۔ وقت اور حالات کے بدل جانے سے معاشرے کے تقاضوں میں بھی تبدیلی آئی ہے۔اس لیے جب ہم جدیدیت کے افسانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں وہ روایتی احساس کہیں نظر نہیں آتا جو ابتدائی دور کے افسانوں یا ترقی پسندی کے دور کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔اس دور کے افسانے میں عشق و محبت کی داستان کم دیکھنے کو ملتے ہیں اس کی جگہ معاشرے میں پھیلی برائی زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
08	68	27-29	ظہیر علی	ظریفانہ تنقید یا ناقدانہ فکشن	2006	اگست	33

ظہیر علی نے اس مضمون میں فکشن کی تنقید کو موضوع بنایا ہے، لیکن انہوں نے صرف اور صرف شفیع شیخ کی تنقید ہی کو اس مضمون میں شامل کیا ہے۔ شفیع شیخ نے صرف فکشن پر ہی تنقید نہیں کیا ہے بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے، جس میں فکشن کے ساتھ ساتھ، شاعری، مرثیہ، مثنوی، طنز و مزاح وغیرہ شامل ہے۔

ظہیر علی نے اس مضمون میں سب سے پہلے شفیع شیخ کی تصنیف ''مجتبیٰ حسین...... ایسا کہاں سے لاؤں'' کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے ظریفانہ تنقید کی اعلیٰ مثال کہا ہے۔ اس سے پہلے شفیع شیخ نے ''شرح دیوان غالب'' میں اس رنگ کی بہاریں دکھائی تھیں۔

شفیع شیخ کا اصل ظریفانہ تنقید پریم چند کے افسانوں پر ہے، جس کی وجہ سے یہ مضمون اس مقالے میں شامل ہوا ہے۔ انہوں نے پریم چند کے سو افسانوں کے حوالے سے پریم چند کے موضوعاتی تنوع اور انسانی سروکار کو سمجھنے کی ایک کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں حج اکبر، فاتحہ، کیفر کردار، خون سفید، زیور کا ڈبہ، گلی ڈنڈا، بعد از مرگ، دست غیب، حسن ظن، چکمہ، قیدی، قاتل، سوانگ، لاٹری، مالکن، وغیرہ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔

آخر میں ظہیر علی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندگی، کائنات اور انسانی وجود کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک ایسا تخلیقی ہنر موجود ہے، جو انہیں کائنات سے جوڑتا بھی ہے اور تخلیقی سطح پر تعلق بھی قائم کرتا ہے، جیسے ''کفن''، ''بند دروازہ''، ''راہ نجات''، ''پوس کی رات''، اور ''نئی بیوی'' وغیرہ میں ہوا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
34	ستمبر	2006	پریم چند کا موضوعاتی تنوع	حسین الحق	4-7	68	09

پریم چند اردو افسانے کے موجد کہلاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر چھوٹا بڑا نقاد ان پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا ہے۔حسین الحق بھی اردو کے ایک اچھے افسانے نگار ہیں۔انہیں افسانے پر قدرت حاصل ہے۔انہوں نے پریم چند کے افسانوں میں موضوعات کے تنوع پر ایک بہترین مضمون قلم بند کیا ہے۔

حسین الحق کا کہنا ہے کہ پریم چند کی اصل اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ ہیرو کا چہرہ بدل دیا، کل تک جس ہیرو پر بادشاہ ،شہزادہ ،راجا اور نواب کا چہرہ لگا ہوا تھا۔پریم چند نے اس پر عام آدمی کا چہرہ لگا دیا اور کہانی کے ہیرو کا یہی اصل چہرہ ہے۔اس سے پہلے جو چہرہ تھا،وہ چہرہ نہیں مکھوٹا تھا۔یہی نہیں پریم چند نے پہلی مرتبہ اردو ہندی قصہ کے قاری کو دربار سے اٹھا کر کھیتوں کھلیانوں ،پنچائتوں اور بازاروں تک پہنچا دیا۔پریم چند کے کرداروں میں پہلی مرتبہ عام آدمی کی صدائے احتجاج سنائی دیتی ہے اور صدیوں پر محیط کرپٹ مہاجنی اور زمین دارانہ نظام کے خلاف عام آدمی نڈر ہو کر بولتا ہے،کبھی کفن ،بوڑھی کاکی ،پوس کی رات،سوا سیر گیہوں اور کش مکش میں اور کبھی بازار حسن ،میدان عمل اور گئو دان میں۔

المختصر یہ کہ حسین الحق نے اپنے اس مضمون میں پریم چند کے ناولوں اور افسانوں ،دونوں میں موضوعاتی تنوع پر بھر پور تجزیہ کیا ہے اور اپنی بات کی تائید،تردید اور انکشاف کے لیے ناقدین کا اقتباس بھی نقل کیا ہے،جس سے ان کی باتیں اور بھی مدلل ہوگئی ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
35	نومبر	2006	محمد مظفر الدین فاروقی ۔۔۔ایک رجحان ساز افسانہ نگار	شبنم رومانی	39-40	68	12

شبنم رومانی نے اس مضمون میں محمد مظفر الدین فاروقی کی افسانہ نگاری کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں محمد مظفر الدین فاروقی بہت معروف تو نہیں ہے، لیکن ان کے افسانے دور حاضر کے اچھے افسانوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ محمد مظفر الدین فاروقی کے مشہور نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بر صغیر سے بہت دور شکاگو (امریکہ) میں مقیم ہیں اور وہیں کے اردو افسانے میں اضافہ کر رہے ہیں۔

شبنم رومانی محمد مظفر الدین فاروقی کے متعلق لکھتی ہیں کہ افسانوں کی اس بھیڑ میں ایک ایسا افسانہ نگار بھی ہے، جس کی جڑیں مٹی میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور جس کا مکالمہ آسمانوں سے ہے۔ یہ افسانہ نگار محمد مظفر الدین فاروقی شکاگو (امریکہ) میں مقیم ہے۔ اس نے ہندی اساطیر کے برجستہ حوالوں سے استدلال پیدا کیا ہے اور جو تاریخ و تہذیب کی روشنائی سے لکھا گیا ہے اور جس گزرے جگہوں کی سفاکی کا تجزیہ کر کے آنے والے زمانوں کی خوفناکی کا احساس دلایا ہے۔

محمد مظفر الدین فاروقی کے افسانے کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے نہیں ہیں، مگر ان پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی نہیں ہیں جو لفظ کے اندر اتر کر اس کی تہہ در تہہ معنویت کا مشاہدہ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ علم کے زور پر افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو مشاہدے کی بنیاد پر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی محمد مظفر الدین فاروقی کے افسانوں کی انفرادیت ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
36	جون	2007	علی باقر۔۔۔اردو فکشن کی منفرد آواز	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	31-32	69	05

ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنا یہ مضمون علی باقر کے انتقال کے فوراً بعد لکھا تھا۔علی باقر اردو دنیا کے مشہور و معروف ادیب تھے۔ انہوں نے اردو فکشن نگاری میں ایک منفرد پہچان قائم کی ہے۔علی باقر کے پانچ افسانوی مجموعے ''خوشی کے موسم''، ''جھوٹے وعدے سچے وعدے''، ''نام کے رشتے''، ''مٹھی بھر دل'' اور ''لندن کے رات دن'' شائع ہوئے ہیں۔ان تمام افسانوی مجموعوں میں ''لندن کے رات دن'' کو سب سے زیادہ شہرت ملی ہے۔

علی باقر کا طرز نگارش انوکھا اور چونکا دینے والا ہوتا ہے۔وہ اس بات کے قائل تھے کہ کہانی میں کہانی پن باقی رہے واقعات کی ترتیب کرداروں کی انفرادیت، تسلسل اور تواتر کا اپنا ہی ایک انداز ہے۔ان کے افسانوی مجموعے ''لندن کے رات دن'' سے ان کے خسر ترقی پسند کے بانی سجاد ظہیر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔سبھی جانتے ہیں کہ سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' کے ذریعے ترقی پسند تحریک کے اساسی نکات کی وضاحت کی تھی۔اس کے مقاصد اور مسائل،اس کے تہذیبی وفکری پس منظر کو واضح کیا تھا۔

ڈاکٹر عقیل ہاشمی مضمون کے آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علی باقر کے پاس لہجہ بھی ہے اور زبان بھی۔ ان کی کہانیوں میں ''موپاساں'' کی خوبی ہے۔ان کا ہنر ان کی خوش اسلوبی ہے۔یورپ کا ماحول ہے۔مغرب کا فیشن زدہ ماحول ہے۔خوشبو ہے ایک عجیب سا جادو ہے۔ان میں بے ساختہ پن ہے، خوشبوؤں کا مہکتا چمن ہے۔ پلاٹ اور کرداروں کا توازن ہے۔ ہر کس و ناکس کے دردمند ہیں۔اظہار میں بے باکی ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
03	70	8-13	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	منشی پریم چند	2008	مارچ	37

منشی پریم چند اردو افسانے کے لیے کوئی نیا نام نہیں ہے۔ بلا مبالغہ اردو فکشن کا سب سے با احترام نام پریم چند ہے۔ جس طرح سے انھوں نے اپنے قلم کے ذریعہ اردو فکشن میں بیسویں صدی کے ہندوستان کی عکاسی کی ہے اور جن مسائل کو انھوں نے اٹھایا ہے۔ ویسی نظیر کسی اور فنکار کے یہاں نہیں ملتی خواہ اس کا تعلق کسی بھی ادب سے ہو۔ پریم چند ہندوستان کے سچے شارح انسانیت کے پیکر اور ترجمان تھے۔ جس طرح انھوں نے ناول کے وقار کو توانائی بخشی وہیں افسانے کو گلے سے لگایا جس طرح سے انھوں نے مشہور ناول ''گئو دان'' لکھا تو وہیں ''کفن'' جیسا لازوال افسانہ لکھ کر اپنے فن کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ چنانچہ عالمی ادب کے سامنے اردو فکشن کا قد بلند ہو جاتا ہے۔ پریم چند کی پرورش و پرداخت اردو زبان وتہذیب کے زیرِ سایہ ہوئی مگر ادھیڑ عمر میں جا کر ہندی زبان کو بھی گلے سے لگایا۔ اسی طرح اردو ہندی کے امتزاج سے ادب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ جو زبان و ادب کے تعلق سے بیش بہا تحفہ ہے۔

ڈاکٹر ام ہانی اشرف نے اپنے اس مضمون میں پریم چند کے متنوع شخصیت، موضوعات اور فن پر روشنی ڈالی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پریم چند میں دنیاوی حرص نہیں تھی۔ وہ انعامات و اعزازات کے بھی خواہاں نہیں رہے۔ ہمیشہ وہی لکھا جو محسوس کیا، جو حقیقت تھا۔ زبان بے حد سادہ اور سلیس تھی۔ فارسی اور عربی الفاظ کی بھر مار نہیں تھی۔ حالانکہ کہ فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ پریم چند ہمیشہ اعلیٰ درجے کی کتابیں تصنیف کرنے کے خواہش مند رہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
04	70	20-24	سید محمد اشرف	طارق چھتاری	2008	اپریل	38

سید محمد اشرف نے اس مضمون میں طارق چھتاری کے حوالے سے ان کی افسانہ نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔انہوں نے اس مضمون میں طارق چھتاری کی ابتدائی زندگی سے لے کر تعلیم اور تصنیفی کارناموں کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ پروفیسر طارق چھتاری کی پیدائش 1/ اکتوبر 1954ء کو قصبہ چھتاری، ضلع بلند شہر میں اتر پردیش کے ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی۔ان کا اصل نام محمد طارق ہے لیکن انہوں نے طارق چھتاری قلمی نام سے ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کی۔ان کا گھرانہ علمی و ادبی اعتبار سے بہت مشہور تھا۔ ان کے والد محترم کا نام غلام محمد تھا جو طارق چھتاری کو بچپن ہی سے کہانیاں پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے،جس کا اثر ان کی کہانیوں میں نظر آتاہ

سید محمد اشرف کے مطابق طارق چھتاری کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے پہلے افسانے ''اپنا اپنا بوجھ'' سے ہوا۔ یہ افسانہ دہلی سے نکلنے والے رسالے ''درخشاں'' میں 1977ء میں محمد طارق کے نام سے شائع ہوا۔طارق چھتاری کے نام سے ان کا پہلا افسانہ 1978ء ''آدھی سیڑھیاں'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔اب تک ان کا صرف ایک ہی افسانوی مجموعہ ''باغ کا دروازہ'' کے عنوان سے 2001ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں ان کے بیس افسانے شامل ہیں ۔یہی مجموعہ جب دوسری مرتبہ 2011ء میں شائع ہوا تو یہ مجموعہ جملہ اکیس افسانوں پر مشتمل ہے۔

مضمون نے نگار نے آخر میں لکھا ہے کہ طارق چھتاری نے تقریباً پچیس سالوں میں یہ افسانے قلمبند کیے ہیں۔اس مدت میں کہانیوں کی کئی کتابیں آسکتی تھی،لیکن طارق چھتاری مقدار سے زیادہ معیار کو اہمیت دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اتنے کم افسانے لکھنے کے بعد بھی طارق چھتاری کا شمار بڑے افسانہ نگارں میں ہوتا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
07	70	20-23	مصحف اقبال توصیفی	علی باقر کی افسانہ نگاری	2008	جولائی	39

مصحف اقبال توصیفی نے اس مضمون میں علی باقر کی افسانہ نگاری کو موضوع بنایا ہے۔انہوں نے علی باقر کی افسانہ نگاری کی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے ان کی مختصر حالات زندگی بیان کی ہے۔

علی باقر کے افسانوں کا بنیادی موضوع عشق ہے۔انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ۲۸ سال کی عمر میں لکھا، اس کے بعد وہ تواتر کے ساتھ لکھتے رہے۔ان کے تقریباً سارے افسانے جلاوطنی کے ماحول میں لکھے گئے ہیں،یعنی کہ لندن یا دوسرے مغربی ملکوں کے شہروں میں۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا بنیادی تجربہ ہجرت کا ہے،لیکن ان سے پہلے اور ان کے بعد لکھنے والے کئی ادیبوں کی طرح وہ ایک بھنور میں قید ہو کر نہیں رہے۔

علی باقر اردو دنیا کے مشہور و معروف ادیب تھے۔انہوں نے اردو فکشن نگاری میں ایک منفرد پہچان قائم کی ہے۔علی باقر کے پانچ افسانوی مجموعے ''خوشی کے موسم''،''جھوٹے وعدے سچے وعدے''،''نام کے رشتے''،''مٹھی بھر دل''اور''لندن کے رات دن'' شائع ہوئے ہیں۔ان تمام افسانوی مجموعے میں''لندن کے رات دن''کو سب سے زیادہ شہرت ملی ہے۔

مضمون کے آخر میں مصحف اقبال توصیفی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علی باقر کی کہانیاں خالص کہانیاں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں قاری کے دل میں سیدھے اتر جاتی ہیں اور خوش بو بن کر ساری ذات میں مہکنے لگتی ہیں۔یہی علی باقر کے افسانہ نگاری کا کمال ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
03	72	26-32	صابر علی سیوانی	افسانوی شخصیت کا مالک......ابراہیم جلیس	2010	مارچ	40

صابر علی سیوانی کا مضمون ''افسانوی شخصیت کا مالک......ابراہیم جلیس'' ابراہیم جلیس کی ادبیت اور شخصیت کے کئی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ابراہیم جلیس کا شمار اردو کے ان گنے چنے ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے المیہ اور طربیہ دونوں طرح کی کہانیاں قلم بند کی ہیں۔

ابراہیم جلیس کی پیدائش 11 اگست 1924ء کو ان کے نانیہال بنگلور میں ہوئی۔ان کا اصلی نام ابراہیم حسین تھا،لیکن انہوں نے ادبی دنیا میں ابراہیم جلیس کے نام سے اپنی شناخت قائم کی۔

ابراہیم جلیس کی ادبی زندگی کی ابتدا تو ان کے اسکول کے زمانے ہی سے ہو چکی تھی،مگر ان کی افسانہ نگاری کا باضابطہ آغاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔ان کا پہلا افسانہ دہلی سے نکلنے والے رسالے ''ساقی'' میں ''رشتہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔اس کے بعد تواتر کے ساتھ حیدرآباد سے نکلنے والے رسالے ''پیام'' میں چھپتے رہے۔دھیرے دھیرے ان کی شہرت پورے ہندوستان میں بطور فکشن نگار کے ہو گئی۔ان کے مشہور ہونے کی وجہ ان کا منفرد اسلوب اور اسٹائل تھا۔

ابراہیم جلیس 1948ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں پر لاہور سے نکلنے والے بچوں کے رسالے ''ساتھی'' سے وابستہ ہو گئے۔اس زمانے میں ان کی مشہور تخلیق ''دو ملک ایک کہانی'' منصۂ شہود پر آئی،جس کو ہندو پاک میں بڑی شہرت ملی۔2 اکتوبر 1977ء میں ابراہیم جلیس اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مختلف کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ان کتابوں کے مطالعے سے ہمیں ابراہیم جلیس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
08	72	27-30	ڈاکٹر زین رامش	شفق کے افسانوں میں عصری انتشار اور تہذیبی انحطاط کی پیشکش	2010	اگست	41

ڈاکٹر زین رامش کا مضمون ''شفق کے افسانوں میں عصری انتشار اور تہذیبی انحطاط کی پیشکش''، شفق کے افسانوں کے حوالے سے دور حاضر میں سماجی اور تہذیبی انتشار کو پیش کرتا ہے۔شفق کا شمار 1960ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔اس دور میں سلام بن رزاق،حسین الحق،سید محمد اشرف، شوکت حیات،عبدالصمد وغیر کے افسانوں کا بول بالا تھا۔ جہاں تک معاصر اردو افسانہ نگاروں کے درمیان شفق کی انفرادیت کی بات شفق کے افسانوں میں عصری انتشار اور تہذیبی انحطاط کی پیش کش کے حوالے سے تفصیلی اور موثر گفتگو کی جا سکتی ہے۔

شفق کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سمٹی ہوئی زمین'' کے عنوان سے 1979ء میں منظر پر آیا۔ دوسرا ''سگ گزیدہ'' 1984ء،تیسرا ''شناخت'' 1989ء اور چوتھا ''وراثت'' کے عنوان سے 2003ء میں منظر عام پر آیا۔

''سمٹی ہوئی زمین'' سے لے کر ''وراثت'' تک کی کہانیوں کے مطالعے سے ایک بات بہت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ شفق کے افسانے موضوع اور اسلوب دونوں سطحوں پر ارتقاء کے مرحلے سے گزرتے ضرور ہیں،لیکن خصوصاً موضوع کے اعتبار سے ان کے یہاں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوتی اور اس طرح ان کی پہچان بنتی ہے۔ان کے افسانوں میں شروع سے آخر تک ایک دہشت ناک فضا چھائی رہتی ہے۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ان کا ہر کردار ایک انجانے خوف میں مبتلا رہتا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
42	اگست	2010	موجودہ دور میں منٹو کی معنویت	ڈاکٹر محمد کاشف	31-35	72	08

سعادت حسن منٹو اردو کا واحد افسانہ نگار ہے جس کی تحریریں آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ ایک صاحب اسلوب نثر نگار تھے جس کے افسانے اردو ادب میں بے مثال حیثیت کے مالک ہیں۔ منٹو ایک معمار افسانہ نویس تھے جنہوں نے اردو افسانہ کو ایک نئی راہ دکھائی۔ افسانہ مجھے لکھتا ہے منٹو نے یہ بہت بڑی بات کہی تھی۔ منٹو کی زندگی بذات خود ناداری انسانی جدوجہد بیماری اور ناقدری کی ایک المیہ کہانی تھی جسے اردو افسانے نے لکھا۔ منٹو نے دیکھی پہچانی دنیا میں سے ایک ایسی دنیا دریافت کی جسے لوگ قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے یہ دنیا گمراہ لوگوں کی تھی۔ جو مروجہ اخلاقی نظام سے اپنی بنائی ہوئی دنیا کے اصولوں پر چلتے تھے ان میں اچھے لوگ بھی تھے اور برے بھی۔ یہ لوگ منٹو کا موضوع تھے اردو افسانے میں یہ ایک بہت بڑی موضوعاتی تبدیلی تھی جو معمار افسانہ نویس کی پہلی اینٹ تھی۔

موجودہ دور کو نظر میں رکھ کر منٹو کا مطالعہ کریں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ منٹو جیسے بے باک، سفاک، جرأت مند حقیقت نگار کی بہت ضرورت ہے۔ منٹو نے زندگی کے صرف انہیں زاویوں سے نقاب اٹھایا ہے جو اپنی شدت سے اور بے پناہ تاثر کے باعث ایک لمحے میں ساری زندگی کے کھوکھلے پن پر ضرب لگا سکیں۔ یہ نفی کا وہ درجہ ہے جہاں وہ مثبت قدر بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد کاشف نے اس مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ منٹو ایک ایسا افسانہ نگار ہے، جس کی اہمیت ماضی کے ہر دور میں تھی اور مستقبل میں بھی ایسے ہی قائم رہے گی۔ ڈاکٹر محمد کاشف نے اپنے مضمون کے آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آج اس تضاد سے بھرپور سماج میں صرف ایسے افسانہ نگار ہی کافی نہیں جنکا برائیوں کے تئیں ردعمل گیلی لکڑیوں کے سلگنے کی طرح ہو بلکہ ایسے افسانہ نگاروں کی بھی ضرورت ہے جن کا فنی رویہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح ہو جو زندگی کے تضاد، کھوکھلے پن اور ریاکاری کو جلا کر خاک کر دے۔ موجودہ دور میں منٹو کی یہی اہمیت ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
43	ستمبر	2010	قومی یکجہتی کے تناظر میں اردو افسانہ	ڈاکٹر غضنفر اقبال	30-33	72	09

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب تہذیب وزبانوں کے ماننے والے رہتے بستے ہیں۔ یہ ملک ہمہ لسانی، ہمہ مذہبی، ہمہ تہذیبی ملک ہے یہاں بھانت بھانت کے لوگ آباد ہیں، ان کی تہذیب و مذاہب الگ الگ ہیں، کثرت میں وحدت یہاں کا شعار شیوہ ہے۔ بقائے باہم اس ملک کی خصوصیات ہے جیو اور جینے دو۔ بردباری، شانتی، امن، مشترکہ قدریں، گنگا جمنی تہذیب اس ملک کا وصف ہے، آن بان شان ہے۔ قومی یکجہتی ایسی طاقت ہے کہ جس میں ہمہ قسم کی ترقی مضمر و پوشیدہ ہے۔ یہ ایسی طاقت ہے جس سے ملک وقوم کا نام روشن ہوتا ہے اور پورے عالم میں ہماری شناخت بنتی ہے۔ بغیر قومی یکجہتی کے ملک وقوم ترقی نہیں کرسکتی۔ ہندوستان ہندو، مسلم، سکھ، عیسائیوں کا ملک ہے۔ سب اس کی ترقی کے خواہشمند ہیں۔

اسی تناظر میں ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اپنا مضمون ''قومی یکجہتی کے تناظر میں اردو افسانہ'' قلم بند کیا ہے، جس میں انہوں نے ان افسانہ نگاروں کے افسانوں پر بات کی ہے جنہوں نے قومی یکجہتی کے موضوعات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر غضنفر اقبال نے سب سے پہلے پریم چند کا ذکر کیا ہے اور ان کے مختلف افسانوں مثلاً ''پنچایت''، ''جلوس''، ''مندر اور مسجد''، ''ڈگری'' وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ان افسانوں میں قومی یکجہتی عناصر کو اجاگر کیا ہے۔

اسی طرح انہوں نے سلام بن رزاق، علی امام نقوی، معین الدین جینا بڑے، طارق چھتاری وغیرہ بلند پایہ افسانہ نگاروں کے قومی یکجہتی سے بھرپور افسانوں کو موضوع بنا کر قومی یکجہتی عناصر کو اجاگر کیا ہے اور اردو افسانوں میں اس موضوع کی وضاحت کی ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
44	ستمبر	2011	ساجد رشید: اردو افسانے کا احتجاجی آہنگ	تسنیم فاطمہ	34-38	73	09

تسنیم فاطمہ نے اپنے مضمون ''ساجد رشید: اردو افسانے کا احتجاجی آہنگ'' میں ساجد رشید کے تمام افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے، جس میں تسنیم فاطمہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانے احتجاجی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ جدید افسانہ نگاروں کی صف میں ساجد رشید تکنیکی سطح پر انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانے اضافی پہلوؤں سے مزین ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانے خواہ وہ پہلے مجموعے کے ہوں یا حال کے مجموعے کے۔ انہیں ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں کے افسانوں کے انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی ادبی مقبولت صاف ظاہر ہوتی ہے۔

تسنیم فاطمہ نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ ساجد رشید کا پہلا اور دوسرا افسانوی مجموعہ فسادات کے موضوع سے یکسر عاری ہے، لیکن تیسرا مجموعہ ''ایک چھوٹا سا جہنم'' میں فسادات کے موضوع پر کئی افسانے موجود ہیں، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ساجد رشید نے جہاں اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے انفرادی مسائل کو جگہ دی ہے وہیں انسانی زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی جگہ دینے میں گریز نہیں کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حالات کے بدلتے تقاضوں سے منھ موڑ کر صرف یک موضوعی کے قائل نہیں بلکہ ان کا ذہن سماج کے مشاہدہ اور محاسبہ میں منہمک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں احتجاجی افسانے ان کے یہاں زیادہ ملتے ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو ہم عصروں میں ساجد رشید کو ممتاز اور ممیّز بناتے ہیں۔

یہ بات حقیقت ہے کہ ساجد رشید کا قلم بہت جلدی تھک گیا اور وہ مالک حقیقی سے جا ملے، لیکن ان کے کارنامے ساجد رشید کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
45	اکتوبر	2011	بے باک افسانہ نگار: مشرف عالم ذوقی	سید احمد قادری	29-34	73	10

سید احمد قادری نے دور حاضر کے ایک بڑے افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی کی افسانہ نگاری کو اس مضمون میں موضوع بنایا ہے اور انہیں بے باک افسانہ نگار کہا ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں لکھا ہے ''زود نویس افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، منٹو اور ذکی انور جیسے مشہور لیکن بسیار نویس افسانہ نگاروں کے بعد جس زود نویس افسانہ نگار پر نظر ٹھہرتی ہے، اس کا نام مشرف عالم ذوقی ہے۔ نویں دہائی کے اس افسانہ نگار کا تعارف پیش کرتا ہوں تو، میں کہوں گا کہ ذوقی بہت زیادہ افسانے لکھتا ہے، بہت خراب لکھتا ہے۔ اچھا بھی لکھتا ہے اور کبھی کبھی بہت اچھا لکھتا ہے۔ آدمی ذہین، حساس اور شریف ہے، لیکن بہت لڑاکو بھی ہے۔''

مشروف عالم ذوقی بہت زیادہ کیوں لکھتے ہیں؟ ذوقی سمندر میں غوطے کیوں لگا تا ہے؟ نئے موضوعات پر زیادہ افسانے لکھنے کی وجہ کیا ہے۔ ان سارے سوالوں کا جواب سید احمد قادری نے اس مضمون میں بہت سلیقے سے دیا ہے۔ ذوقی نے بہت سے افسانے لکھے ہیں، جن میں ان کی کچھ مشہور کہانیاں قابل ذکر ہیں۔ جیسے امام بخاری کی نیپکن، سناٹے میں تارا، دادا اور پوتا، آپ شہر کا مزاق نہیں اڑا سکتے، فریج میں عورت، فزکس کیمسٹری، الجبرا وغیرہ مشہور افسانے تسلیم کیے جاتے ہیں۔

غرض مشرف عالم ذوقی کا افسانوی سفر آج بھی تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ ان کے اپنے انہیں خصوصیات، تکنیک، ٹریٹ منٹ، انداز و بیان اور عصر حاضر سے ہم آہنگ موضوعات کی وجہ سے دور حاضر کے لکھنے والے افسانہ نگاروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
46	اپریل	2012	اردو کی نئی بستیوں کا نسائی افسانوی ادب	حلیمہ فردوس	33-36	74	04

اردو کی نئی بستیوں سے مراد اردو کے وہ علاقے ہیں جہاں اردو زبان ایک نئی زبان کے طور پر متعارف ہوئی۔ مثال کے طور پر امریکہ، جاپان، روس، لندن یعنی کہ مغربی ممالک کے وہ تمام علاقے جہاں پر اردو زبان میں ادب تخلیق کیا جارہا ہے۔

حلیمہ فردوس نے اپنے اس مضمون میں انہیں بستیوں کے اردو ادب خاص طور سے نسائی افسانوی ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں جن خواتین فکشن نگاروں نے اپنی شناخت قائم کی ہے ان میں لالی چودھری، سلطانہ مہر، حمیدہ معین رضوی، صفیہ صدیقی، محسنہ جیلانی، شاہدہ احمد، بانو ارشد، شکیلہ رفیق، فرحت پروین، عذرا نقوی، شائستہ سیدا یمن، نعیمہ ضیاء الدین وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ان خواتین کی کہانیوں بظاہر رومانی کہانیوں میں محبت کا لافانی جذبہ، انسان کی بدبختی، عورت اور مرد کے رشتے کے مختلف مسائل ملتے ہیں۔ مغربی ماحول میں عورت آزاد ہے مگر اس ماحول میں بھی اس کا مقدر مرد کے ہاتھوں رہن ہے۔ عورت کے روم روم سے نکلتی آہیں ان خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوی انجمن میں رچ بس گئی ہیں۔ نمائندہ خواتین افسانہ نگاری کی تخلیقات سے اردو کی نئی بستیوں کے معاشرے کی حقیقت کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

مضمون کے آخر میں حلیمہ فردوس یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ یہ افسانوی تخلیقات بارودی ڈھیر پر بیٹھے ہوئے مغربی معاشرے کی منھ بولتی تصویریں ہیں یا یوں کہیے کہ ان افسانوں کے مطالعے سے مغربی معاشرہ کی چھیدوں بھری اخلاقی اوذونی چادر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے معاشرے کے حقائق کو درشانی والی خواتین افسانہ نگار کی یہ تخلیقات ہمارے افسانوی ادب کا حصہ ہیں۔ ہم اس سرمائے سے ہرگز گریز نہیں کرسکتے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
47	مئی	2012	شفق کے افسانے ایک مطالعہ	تسنیم فاطمہ	43-47	74	05

تسنیم فاطمہ نے اپنے اس مضمون میں شفق کے افسانوں کا بھرپور مطالعہ پیش کیا ہے۔شفق کا تعلق افسانہ نگاری کے اس دور سے ہے جسے ہم جدیدیت کے نام سے جانتے ہیں۔جدیدیت کے تحت لکھنے والے افسانہ نگاروں کی فہرست میں شفق کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ان کے افسانوں میں جدیدیت کی جھلک ہر جگہ صاف طور پر نظر آتی ہے۔علامت اور استعارے کے بنیاد پر اپنی کہانیوں کو کھڑا کرنا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ان کے بعض افسانوں میں استعاراتی نظام اور علامتی ابہام اس قدر غالب ہے کہ ان کی ان کہانیوں پر تجرید کا اثر ہی نہیں بلکہ تجرید کا شکار بھی ہو جاتی ہیں۔علامت اور استعارے کے استعمال میں اس حد تک گزر گئے ہیں کی افسانے کا حقیقی عنصر یعنی ''کہانی پن'' مجروح ہو گیا ہے۔البتہ ان کی بیشتر کہانیاں علامتی اور استعاراتی ہوتے ہوئے بھی قابل فہم ہیں۔شفق نے اپنے افسانوں میں جس سنجیدگی سے فکشن کی تکنیک،اس کے موضوعات اور اسلوب کا خیال رکھا ہے اس نے نہ صرف قارئین کو بلکہ ادب کے ناقدین کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ان کے افسانوں میں انسانی قدروں کی پامالی کا جو دکھ ہے وہ تہذیب و معاشرت اور سیاست کے چہروں کی اس طرح نقاب کشائی کرتا ہے کہ جیسے کوئی ہماری نفسیات کی گرہیں کھول رہا ہو۔شفق نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن ان میں عنفوان شباب کے جذبات اور رومان کی ہلکی پھلکی جھلک نہیں نظر آتی ہے بلکہ ان کے افسانے جبلی حسیت کے حامل ہیں۔

تسنیم فاطمہ نے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ شفق اب ہمارے درمیان نہیں رہے،لیکن ان کے افسانے اور ناول انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
48	فروری	2013	نورالحسنین کا افسانوی سفر	ڈاکٹر محمد کاشف	39-43	75	02

اس مضمون میں ڈاکٹر محمد کاشف نے اورنگ آباد دکن کے مشہور و معروف فکشن نگار کے افسانوی سفر کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔محمد کاشف نے مضمون کی ابتدا میں افسانوی منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے نورالحسنین کا دور حاضر کے افسانہ نگاروں میں ان کا مقام و مرتبہ بتایا ہے۔اس کے بعد نورالحسنین کے اہم افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے محمد کاشف نے افسانہ ''بازی گر کا تجزیہ کیا ہے۔ان کے مطابق یہ کہانی تمثیلی بیانیہ کی ایک خوبصورت مثال ہے۔اس کے بعد افسانہ ''چیخیں'' کا تجزیہ کیا ہے۔یہ افسانہ آج کے شہری و مادی زندگی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔انسان مادیت کے اس دور میں کتنا بھی لالچ، بے ایمانی، رشوت ستانی، ترغیب وتحریض سے بچتا ہے اتنا ہی یہ چیزیں اپنی جانب کھینچتی ہیں۔اس کے بعد افسانہ ''بدذات'' کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کہانی کو انہوں نے منٹو کی کہانیوں سے قریب بتایا ہے اور لکھا ہے کہ منٹو کی طرح نورالحسنین کی یہ کہانی بھی غلاظت میں انسانیت کا درس دیتی ہے۔اس کے بعد انہوں نے افسانہ ''رنگوں کا اسیر'' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔اسی طرح انہوں نے ان کے مختلف افسانوں مثلاً ''نجات کے بعد''،''باغ کا در کھلا''، ''وصیت''، ''گڑھی میں اترتی شام'' وغیرہ افسانوں کا بھی تجزیہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد کاشف کا کہنا ہے کہ نورالحسین نے متنوع موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔گاؤں سے لے کر شہر اور مٹروسٹی کے سماجی، معاشی اور ثقافتی حالات اور صورت حال کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ نورالحسنین کو مذہب اور مذہب اقدار بے حد عزیز ہیں۔اس موضوع پر بھی ان کے کئی افسانے ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
12	75	28-34	نورالحسنین	عبدالصمد......ایک بلند قامت افسانہ نگار	2013	دسمبر	49

نورالحسنین نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ عبدالصمد نے جس دور سے لکھنا شروع کیا وہ نہ صرف جدیدیت کا دور تھا بلکہ اس میں جدیدیت کا بول بالا بھی تھا اور ہر دوسرا ادیب جدیدیت کے سایہ تلے آنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔عبدالصمد نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا مختصر اردو افسانے سے کی تھی ان کی پہلی کہانی ''جھوٹ کی سزا'' ادبی رسالہ ''غنچہ'' میں 1961 میں شائع ہوئی۔ 1967 میں ان کا ایک افسانہ ''ایک مرغ'' رسالہ ''آئندہ'' جمشید پور میں شائع ہوا۔یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔1980 کے بعد انہوں نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور اسی صنف میں عبدالصمد کو لافانی شہرت حاصل ہوئی۔عبدالصمد نے اپنے عہد کے سیاسی وسماجی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے افسانوں میں تاریخ وتہذیب اور معاشرت وسیاست مل کر اپنے عہد کے پرآشوب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔انہوں نے ایسے موضوعات ومسائل کو اپنی تخلیق کا حصہ بنایا جو ہندوستانی سماج کی جڑوں کو کھوکھلی کر رہے ہیں۔یہ عبدالصمد کے فن کا کمال ہے کہ انہوں نے فرقہ پرستی، ہجرت، فسادات، رشوت، بدعنوانی، تعصب، بےضمیری وتنگ نظری جیسے اہم مسائل کو اپنے ناولوں کے ذریعہ سماج کے سامنے پیش کیا۔اس کے علاوہ عبدالصمد نے اپنے افسانوں میں تہذیبی زوال، اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں اور استادوں کی برائیوں کے ساتھ ان سے ہورہے جرائم کو دکھایا ہے اور تقسیم ہند سے لے کر آج تک ہندوستانی سیاست کے مختلف پہلوؤں کو خاصی بےباکی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ ہندوستانی سیاست کے نشیب وفراز کو عبدالصمد نے اس طرح پیش کیا ہے کہ سیاست کا اصل چہرہ سامنے آجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مضمون نگار نے انہیں بلند قامت افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
50	جنوری	2014	نیر مسعود کی افسانہ نگاری	شریف احمد خان	40-48	76	01

نیر مسعود کا شمار دورِ حاضر کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے مخصوص اسلوب اور منفرد لب و لہجے کے باعث اردو افسانہ نگاری میں اپنا ایک الگ مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نیر مسعود کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے تعلیمی دور سے ہی ہوا، جب انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں بچوں کے لیے ایک مختصر ڈراما ''سوتا جاگتا'' اور بارہ سال کی عمر میں افسانہ ''سیمیا'' لکھا۔ اس کے بعد وہ پندرہ سولہ سال تک کہانیاں لکھتے رہے، لیکن اس کے بعد انہوں نے تخلیقی کام کرنا بند کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی پی ایچ۔ ڈی۔ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ مکمل کرنے کے بعد درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ازسرِ نو تخلیق کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے بہترین افسانے تخلیق کیے، جو اردو ادب میں ان کے شناخت کی وجہ بنے۔ چونکہ نیر مسعود کے افسانے ان کے معاصرین افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں، جن میں ''سیمیا'' 1984، ''عطرِ کافور'' 1990، ''طاؤس چمن کی مینا'' 1998 اور ''گنجفہ'' 2008 شامل ہیں۔

مضمون نگار نے اس مضمون میں نیر مسعود کے تمام اہم افسانوں کا موضوعاتی اور فنی سطح پر جائزہ لیا ہے اور ان خوبی اور خامی دونوں کو واضح کیا ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ نیر مسعود کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے قوت توانائی کے ساتھ ساتھ علم سے شغف اور تاریخ سے واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کے افسانے میں ماضی سے جڑی ہوئی بہت سے چیزیں ملتی ہیں۔ اس لیے ان کو سمجھنے کے لیے ماضی اور حال دونوں پر قاری کی گرفت ہونی چاہیے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
03	76	27-34	نورالحسنین	قدیر زماں اوران کے افسانے......ایک جائزہ	2014	مارچ	51

نوالحسنین ایک بہترین فکشن نگار کے ساتھ ساتھ عمدہ تنقید نگار بھی ہیں۔انہوں نے اس مضمون میں قدیر زماں کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی اور فنی سطح پر جائزہ لیا ہے۔نورالحسنین نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ قدیر زماں کے افسانے میں پڑھتا تھا تو ان کی فن کاری کی کوئی صورت میرے ذہن میں نہ بن پائی لیکن جب ان کا افسانوی مجموعہ ''کھلونے والا'' پڑھا تو میں ان کی افسانہ نگاری کا قائل ہو گیا۔قدیر زماں کے افسانے چاہے وہ ''کاوش'' ہو''ہر مرض'' ،''کچھوے کی واپسی''،''راہ گیر''،''گردش'' ہو یا پھر وامندگی کا شوق'' ہر افسانے میں ایک بالغ سوچ اور عمدہ عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔

موضوعاتی سطح پر قدیر زماں اپنے معاصرین سے بہت مختلف تو نہیں ہیں لیکن کہانی کا واقعہ بننے کا ان کا اپنا انداز یقیناً بہت مختلف ہے۔اس وجہ سے ان کا سلوب بھی اس قدر پر کشش ہے کہ قاری اس کے سحر میں کھو جاتا ہے اور افسانے کا تجسس اس سے پورا افسانہ ایک ہی نشست میں پڑھوا لیتا ہے۔

آخر میں نورالحسنین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قدیر زماں ایک متنوع افسانہ نگار ہیں اور اکثر اپنے افسانوں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو بہت حد تک اچھوتے ہوتے ہیں۔انہیں زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے اور سب سے اہم بات وہ اپنے افسانے کی جزئیات، ماحول اور کرداروں کی زبان پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔میں افسانے کے قاری کو خاص طور پر ان کے افسانوں کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
04	76	42-46	محمد جاوید	ترنم ریاض کے افسانوں میں کشمیری تہذیب وثقافت	2014	اپریل	52

اردو کی خواتین فکشن نگاروں میں ترنم ریاض کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ان کی پیدائش 9راگست 1963 میں کشمیر کے ایک مشہور ومعروف شہرسری نگر میں ہوئی۔ترنم ریاض کے بچپن کا نام فریدہ ترنم تھا،لیکن ان کی شادی جب پروفیسر ریاض پنجابی سے ہوئی تو انھوں نے اپنا نام ترنم ریاض رکھ لیااور آج ادبی دنیا میں اسی نام سے جانی جاتی ہیں۔

ترنم ریاض کا ایک افسانہ اور ایک نظم بیک وقت روزنامہ ''آفتاب'' سری نگر میں شائع ہوئے۔ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے ''یہ تنگ زمین'' 1998 ''ابابیلیں لوٹ آئیں'' 2000 ''یمبر زل'' اور ''میرا رخت سفر'' 2008 اور دوناول ''مورتی'' اور ''برف آشنا پرندے'' شائع ہوکر منظرعام پر آ چکے ہیں۔

ترنم ریاض کے افسانوں میں کشمیری تہذیب وثقافت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ترنم ریاض اپنے اطراف واکناف کے حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی حیات عالمی کے مسائل کو انسانی نظر سے دیکھتی ہیں۔ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کی الم ناک داستان دیکھنے کو ملتی ہیں۔رشتوں کی خوبیوں اور کمزوریوں کا تذکرہ بھی ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ترنم ریاض کے افسانوں میں کشمیری کلچر دکھائی دیتا ہے جسے انھوں نے بڑے رچاؤ اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

محمد جاوید نے مضمون کے آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ترنم ریاض کے افسانے اور کردار کشمیری تہذیب وثقابت کی روایت میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ان کے یہاں کشمیر کے حالات،واقعات،ماحول اور معاشرے کے مسائل پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
53	اپریل	2014	''آسمان سے باتیں'' ایک تجزیاتی مطالعہ	وحیدالظفر خاں	58-63	76	04

وحیدالظفر خان نے اس مضمون میں ف۔س۔اعجاز کا افسانہ''آسمان سے باتیں'' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔اس کہانی کی ابتداانسانی زندگی کے عام تجربات سے ہوتی ہے،لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اس کہانی میں تجسس،تخیل اورتخلیقی کیفیت نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔

فنکار نے اس کہانی میں انتہائی موثر اوردل کش انداز میں زمین۔کشش ثقل اورانسانی زندگی کے ربط کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، جہاں سے زندگی کا بیج پھوٹتا ہے، اگتا ہے، بڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے۔زمینی حقیقت کااعتراف اوراحساس زمین کی مہک سے ابھرتا ہے، کیوں کہ زمین ہی سے آسمان کوطاقت ملتی ہے۔

وحیدالظفر خان کا کہنا ہے کہ افسانے کا اختتامیہ ڈرامائی طور پر چونکانے والا ہے۔شراب وشباب کی سرشاری میں شرابور بے حس ساعت فنکار کے لیے ناقابل برداشت ہے۔افسانے کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تکنیک ہے۔جس کی وضاحت کے بغیرافسانے کی فنی خوبی کاایک اہم زاویہ گم ہوجاتا ہے۔

المختصر یہ کہ وحیدالظفر خان نے اس افسانے کا تجزیہ بہت خوبصوری سے کیا ہے۔انہوں نے پلاٹ، کردار، تکنیک اورزبان وبیان پرنہایت ایمانداری سے گفتگو کی ہےاورغیر جانبدارانہ طور پراپنی رائے کوپیش کیاہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
54	جون	2014	خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں تصورِ زیست وانسانیت	ابوالکلام	25-32	76	06

''خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں تصور زیست وانسانیت'' میں ابوالکلام نے انسانی زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے معروف شاعر برج نارائن چکبست کے ایک شعر کا سہارا لیا ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

خواجہ احمد عباس کو آدمی میں انسان بننے کی مضمر قوتوں اور صلاحیتوں کا شدید احساس تھا اور ان پر مصمم یقین بھی تھا۔اس لیے وہ ان کی مضمر مثبت قوتوں اور صلاحیتوں کو کھل کھیلنے کی تمام امکانات کے قول وعمل کو اپنے افسانوں میں متلاشی دکھائی دیتے ہیں اور ان کو یقینی بنانے کے لیے طرح طرح کی فنکارانہ کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں تاکہ زیست وانسانیت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوکر ارتقائی مراحل طے کریں۔

ابوالکلام نے اس مضمون میں خواجہ احمد کے تمام افسانوں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ ثابت کر دیا ہے کہ خواجہ احمد کے افسانے صحت مند تصورِ زیست اور انسانیت پر دلالت کرتا ہے کہ انسان انسانیت پر مبنی ہمدردانہ زیست کا متقاضی ہوتا ہے اور یہی تقاضا انسان کو تصور زیست وانسانیت کے لیے افروزی کا سبب بنتا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
07	76	7-13	عتیق اللہ	اردوافسانہ:ایک صدی	2014	جولائی	55

اردو افسانہ بیسوی صدی کی پیداوار ہے۔اس سے پہلے اردو کا نثری سرمایہ داستان اور ناول کی شکل میں ملتا ہے۔اردو میں مختصر کہانیاں تو انیسویں صدی کے شروع ہی میں ملنے لگتی ہیں ۔اس کی ابتداء جان گلکرسٹ نے 1803ء میں ''قصص مشرق'' لکھ کر کی۔اس کے بعد نذیر احمد نے ''منتخب الحکایات'' لکھی۔ اس میں 77 حکایتیں شامل ہیں۔ بیسوی صدی کی ابتدا میں راشد الخیری نے نصیر اور خدیجہ، بدنصیب کا لال، عصمت وحسن اور سجّاد حیدر یلدرم نے غربت ووطن، دوست کا خط، احمد وغیرہ افسانے لکھے، لیکن ان میں سے کچھ فنی اعتبار سے مکمل نہیں تھے اور کچھ طبع زاد نہیں تھے۔اردو افسانے کا فنی اعتبار سے باقاعدہ آغاز 1907ء میں شائع ہوئے پریم چند کے افسانے'' دنیا کا سب سے انمول رتن'' سے ہوا اور پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار تسلیم کیے گئے۔

عتیق اللہ نے اس مضمون''اردو افسانہ:ایک صدی'' میں پریم چند کو پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔ پریم چند کی اس روایت کو ترقی پسندوں نے ایک امانت کے طور پر قبول کیا۔اس دور میں کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ نے افسانوی ادب میں خاصہ اضافہ کیا۔

ترقی پسند تحریک کے بعد اردو افسانے میں ایک نیا موڑ آیا، جسے جدیدیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس دور کے اہم افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، انور سجاد، احمد ہمیش، سریندر پرکاش، بلراج مین را وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔اس کے بعد مابعد جدید کا دور شروع ہوتا ہے، جو ابھی چل رہا ہے۔اسی منظرنامے کو عتیق اللہ نے اپنے اس مضمون میں اجاگر کیا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
09	76	57-61	حامد رضا صدیقی	خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ	2014	ستمبر	56

حامد رضا صدیقی نے اپنے مضمون ''خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ'' میں بہت جانب داری سے ان کے افسانوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔انہوں نے پہلے ان کی افسانہ نگاری سے اپنے قارئین کو متعارف کرایا ہے اس کے بعد ان کے اہم افسانوں کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے 1936ء میں افسانے لکھنا شروع کیا اور تقسیم ہند تک متواتر لکھتے رہے۔ان کے ابتدائی افسانوں میں ابابیل، ایک لڑکی، دو پائلی چاول، زندگی، انار چڑھاؤ، پاؤں میں پھول اور معمار بہت مشہور ہوئے۔

خواجہ احمد ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو صحت مند سماج کی تشکیل کے لیے مقصدیت کو فن پر ترجیح دیتے ہیں اور وہ اپنے دور کے دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مقصدیت اور افادیت کے حامی ہیں۔

حامد رضا صدیقی خواجہ احمد کی اہم کہانیوں کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی کہانیوں پر فنی اور فکری سطح پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی کہانیوں میں کوئی گہرائی اور گیرائی نہیں پائی جاتی ہے۔ عام طور پر ان کہانیوں کا موضوع ایک عام انسان کی زندگی کی کوئی نہ کوئی چلتی پھرتی تصویر ہوتی ہے۔جس کو پڑھ کر قاری فوری طور پر بلا کی تلخی محسوس کرتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی احساس کرتا ہے کہ فنکار انسانی زندگی سے کربناکی اور تلخی نکال کر مسرت وشادمانی بھر دیتا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
57	ستمبر	2014	رفیق جعفر کی افسانہ نگاری	رؤف صادق	62-64	76	09

رؤف صادق کا تعلق ممبئی سے ہے۔انہوں نے اپنے مضمون ''رفیق جعفر کی افسانہ نگاری''میں رفیق جعفر کے اہم افسانوں میں موضوع اور فن کے حوالے سے ایک بہترین گفتگو کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ رفیق جعفر کے فن کی خصوصیت ان کا عام لب ولہجہ ہے۔اظہار کی شائستگی فکری و جمالی حسیت میں نکھار پیدا کرتی ہے۔ان کے افسانے زبان و بیان کے لحاظ سے صحافتی انداز فکر کے غماز ہوتے ہیں۔تجربات ومشاہدات کے زیر سایہ پروان چڑھتے ہیں۔ان کے جدید افسانے بھی کہانی پن سے عاری نہیں ہوتے۔ بلکہ بیانیہ طرز نگارش افسانے کی فضا کو ساز گار بنائے رکھتے ہیں۔

رفیق جعفر کے افسانے عموماً بیانیہ ہوتے ہیں۔ان کے دور جدیدیت کے افسانے بہت عمدہ ہیں اور ان میں زندگی کے چھوٹے بڑے شہری مسائل اور موضوعات پر مبنی ہیں۔ان کے افسانے ہندوستان کے موقر رسائل وجرائد سب رس،تحریک،آہنگ،اسباق کاروانے ادب، بیباک،انقلاب، منصف،اعتماد، ملاپ، وغیرہ میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں۔

رفیق جعفر کے افسانوں میں ڈرامائیت، پر اسراریت بالخصوص افسانے کے کلائمیکس حیران کن ہوتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں سماج کے متضاد نظریات،عصر حاضر کے مثبت ومنفی دونوں اثرات عدم تحفظ اور انسانی مسائل پر سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔

اس کے علاوہ رفیق جعفر کے افسانوں میں فکر کی دبیز چادر نہیں ہوتی،لیکن موضوع کو برتنے کا طریقہ ضرور دعوت فکر دیتا ہے۔عام طور پر وہ اپنے افسانوں میں نچلے، دبے کچلے اور متوسط طبقے کے حالات زندگی کو درشاتے ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
58	اکتوبر	2014	’فقط بیان تک‘‘...... ایک معروضی مطالعہ	سلام بن رزاق	33-37	76	10

سلام بن رزاق نے اپنے اس مضمون میں نورالحسنین کے افسانوی مجموعے’’فقط بیان تک‘‘ کا معروضی مطالعہ پیش کیا ہے۔نورالحسنین کا شمار 1980 کے بعد کے لکھنے والے افسانہ نگاروں کے معتبر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے اردو فکشن کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔وہ نہ صرف ایک اچھے فکشن نگار ہیں بلکہ انہوں نے ڈرامہ نگاری ،فیچر نگاری،تنقیدی مضامین،خاکے،کتابوں پر تبصرے اور بچوں کے ادیب کے طور پر بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔

نورالحسنین کی پیدائش 19/ مارچ 1950ء کو اورنگ آباد ،مہاراسٹر کے ایک صوفی خاندان میں ہوئی۔ان کا پورا نام سید نورالحسنین نقش بندی ہے اور انہوں نے ادبی دنیا میں نورالحسنین کے نام سے شہرت حاصل کی ۔نورالحسنین تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے ’’معین العلم ہائی اسکول،اورنگ آباد‘ ‘ میں استاد کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دی۔اس کے بعد انہوں نے اناؤنسر آ کاش وانی اورنگ آباد اور گیان وانی اورنگ آباد میں کام کیا۔

سلام بن رزاق نے نورالحسنین کے افسانوی مجموعے’’فقط بیان تک‘‘ کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ان میں شامل افسانوں کی خوبیوں اور خامیوں کو معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔نورالحسنین کا ادبی سفر ابھی جاری ہے۔ان کے سامنے امکانات کی وسیع دنیا موجود ہے۔لہٰذا ختم کلام کے طور پر بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اردو افسانے کو ان سے بہت سی توقعات ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ نورالحسنین اردو افسانوں کی توقعات پر کھرے اتریں گے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
59	دسمبر	2014	تاریخی افسانویت	خورشید احمد / ابوالکلام	31-34	76	12

اس مضمون کو خورشید احمد اور ابوالکلام دو لوگوں نے مل کر لکھا ہے۔ان لوگوں نے اس مضمون میں افسانوں میں تاریخی پہلو کو تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ تاریخ محض حقائق اور ان کے تجزیے کو پیش کرتی ہے۔فکشن نگار زندگی کا غائر مطالعہ و مشاہدہ اور تجزیہ کرتا ہے۔ نیز تخیل کی آمیزش سے زندگی کی حقیقتوں کو افسانویت کی متنوع شکل میں پیش کرتا ہے۔افسانویت بالخصوص تاریخی افسانویت میں جب تک تخیل سے کام نہ لیا جائے اس وقت تک وہ افسانویت نہیں ہوسکتی ہے، کیوں کہ تاریخ کو افسانویت میں بدلنے کے لیے تخیل بنیادی شرط ہے۔یہی وجہ ہے کہ تاریخی افسانویت سب سے پیچیدہ اور مشکل قسم کا فن ہوتا ہے۔کیوں کہ اس نوع کی بنیادیں تضاد پر مبنی ہوتی ہیں۔

مضمون نگاروں کا کہنا ہے کہ اس ضمن میں دو باتیں اہم ہیں۔ایک یہ کہ تاریخی افسانویت میں زیادہ تر واقعات کی صداقت کا خیال رکھا جاتا ہے۔دوسری قسم میں تاریخی حقائق اور واقعات دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔

مضمون نگاروں کا اس مضمون کے متعلق یہ بھی کہنا ہے کہ اس طرح وہ تاریخی افسانویت سب سے زیادہ میعاری ہوگی ،جس میں تخیل اور تاریخ دونوں کی آمیزش متناسب و متوازن اور فنکارانہ ہوگی، لیکن میعاری افسانویت کے لیے قدامت لازمی ہے، کیوں کہ جدید تاریخ میں تخیل کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے اور یہاں تخیل کو تاریخ سے آمیزش کرنا مشکل عمل ہے۔تاریخی مواد کی قدامت کے سلسلے میں ناقدین کا ماننا ہے کہ کم سے کم سو سال ماضی میں جاکر افسانویت کے لیے واقعات کا انتخاب کرنا چاہیے تاکہ تاریخ کے واقعات پر زمانے کی گرد جم جائے اور تخیل کی گنجائش پیدا ہو جائے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
12	76	35-42	شہناز خاتون	کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں میں رومانیت کی سطح	2014	دسمبر	60

شہناز خاتون نے اس مضمون میں کرشن چندر کے حوالے سے ایک نئی بحث رومانیت کو اٹھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کرشن چندر اپنے آپ کو لکھنے والا جانور کہتے تھے۔اس لیے وہ مسلسل لکھتے رہتے تھے۔اتنی تیز رفتاری سے لکھتے تھے کہ انہیں پلٹ کر دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ہوتی تھی۔اس لیے اگر کرشن چندر کی پوری تخلیقات کو آج کے نوجوان کے سامنے رکھ دیا جائے تو آج کا نوجوان قاری ان میں سے اکثر تخلیقات کو کرشن چندر کی تخلیق کو ماننے سے انکار بھی کرسکتا ہے۔

شہناز خاتون نے اسی بحث کو اس مضمون میں اٹھایا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کرشن چندر کے بعد بھی کہانی لکھنے والے آئے۔انہوں نے خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے اپنی نگاہ کو نئی ترتیب دی۔انہوں نے بھی کرشن چندر کی طرح نہیں لکھا بلکہ اپنی طرح لکھا،مگر کرشن چندر نے انہیں فن کار نہیں مانا۔

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ کرشن چندر کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموپر تقریباً سو کتابیں ہیں۔نئے ناقد کے لیے کرشن شناسی کے باب میں ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ کرشن چندر کے فن کی خوبیوں کا سراغ لگا کر اس کے فن سے نتیجہ اور بامعنی سلیقہ پیدا کرنے میں نئے فکشن نگار کی مدد کریں کیوں کہ اب ہمارے افسانہ نگاروں کو فکشن کی روایات کے محل میں آنکھ بند کر دینے سے جو ٹوٹ پھوٹ اور انہدام ہوا ہے اور اسے فکشن کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
61	جنوری	2015	نیر مسعود بحیثیت افسانہ نگار	عرشیہ تسنیم	46-49	77	01

نیر مسعود کا شمار دورِ حاضر کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے مخصوص اسلوب اور منفرد لب و لہجے کے باعث اردو افسانہ نگاری میں اپنا ایک الگ مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نیر مسعود کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے تعلیمی دور سے ہی ہوا، جب انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں بچوں کے لیے ایک مختصر ڈراما ''سوتا جاگتا'' اور بارہ سال کی عمر میں افسانہ ''سیمیا'' لکھا۔اس کے بعد وہ پندرہ سولہ سال تک کہانیاں لکھتے رہے، لیکن اس کے بعد انہوں نے تخلیقی کام کرنا بند کر دیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی پی ایچ۔ڈی۔ کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ پی ایچ۔ڈی۔ مکمل کرنے کے بعد درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ازسرِنو تخلیق کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے بہترین افسانے تخلیق کیے، جو اردو ادب میں ان کے شناخت کی وجہ بنے۔ چونکہ نیر مسعود کے افسانے ان کے معاصرین افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، جن میں ''سیمیا'' 1984، ''عطر کافور'' 1990، ''طاؤس چمن کی مینا'' 1998 اور ''گنجفہ'' 2008 شامل ہیں۔

مضمون نگار نے اس مضمون میں نیر مسعود کے تمام اہم افسانوں کا موضوعاتی اور فنی سطح پر جائزہ لیا ہے اور ان خوبی اور خامی دونوں کو واضح کیا ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ نیر مسعود کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے قوت توانائی کے ساتھ ساتھ علم سے شغف اور تاریخ سے واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔ان کے افسانے میں ماضی سے جڑی ہوئی بہت سے چیزیں ملتی ہیں۔اس لیے ان کو سمجھنے کے لیے ماضی اور حال دونوں پر قاری کی گرفت ہونی چاہیے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
01	77	66-71	معین الدین عثمانی	زندگی کی سچائیوں کا بیانیہ......ایک بوند زندگی	2015	جنوری	62

معین الدین عثمانی نے اپنے اس مضمون میں جموں وکشمیر کے ایک نمائندہ افسانہ نگار بلراج بخشی کے افسانوی مجموعے ''ایک بوند زندگی'' میں شامل زندگی کی سچی بیانیہ کو پیش کیا ہے۔بلراج بخشی بنیادی طور پر شاعر ہیں،لیکن ان کا ایک افسانوی مجموعہ بھی منظرعام پر آ چکا ہے۔اس مجموعے میں تقریباً پندرہ کہانیاں شامل ہیں اور پہلی کہانی کا عنوان فیصلہ ہے۔معین الدین عثمانی نے اپنی بات مجموعے میں شامل کہانی ''فیصلہ'' ہی سے شروع کی ہے۔اس کے بعد ہر کہانی کا الگ الگ تجزیہ پیش کیا ہے۔

تمام کہانیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد معین الدین عثمانی نے دو اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ایک یہ کہ اردو خود کفیل زبان ہے،جس میں دیگر زبانوں کے الفاظ اسطرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کی اپنی کوئی شناخت ہی نہ ہو۔اس کے باوجود کہانیوں میں انگریزی اور ہندی لفظوں کا استعمال عجیب سا لگتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کسی عقیدے یا مذہبی معاملے کو تنقید کا نشانہ بنانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ہر انسان اپنے مزاج اور فکری سطح کے مطابق جیتا ہے اور فنکار کی بھی یہی توقع ہونی چاہیے۔

مجموعے میں شامل تقریباً سبھی کہانیاں ایسی ہیں جو نہ صرف ہمیں حیرت میں دال دیتی ہیں بلکہ شروع سے آخر تک اپنے آپ کو پڑھوانے میں کامیاب ہے۔ یہی بلراج بخشی کے افسانوی مجموعے ''ایک بوند زندگی'' کی کامیابی کی دلیل ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
03	77	35-38	زبیر عالم	بیگ احساس کی افسانہ نگاری ''دخمہ کی روشنی میں''	2015	مارچ	63

زبیر عالم نے اس مضمون میں بیگ احساس کی افسانہ نگاری کا جائزہ ان کے تیسرے افسانوی مجموعے ''دخمہ'' کی روشنی میں لیا ہے۔ بیگ احساس نے 1971ء میں افسانے کی دنیا میں قدم رکھا۔ ان کا پہلا افسانہ 'سراب' کے عنوان سے دہلی سے نکلنے والے رسالے 'بانو' میں چھپا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خوشہ گندم'' کے عنوان سے 1979ء میں، دوسرا ''حنظل'' کے عنوان سے 1993ء میں اور تیسرا یعنی اب تک کا آخری افسانوی مجموعہ ''دخمہ'' کے عنوان سے 2015ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے پر بیگ احساس کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

دخمہ میں جملہ گیارہ افسانے شامل ہیں جن کے نام اس طرح ہیں۔ سنگ گراں، کھائی، چکرویو، درد کے خیمے، سانسوں کے درمیاں، نجات، دھار، شکستہ، دخمہ، نمی دانم کہ اور رنگ کا سایہ۔ زبیر عالم نے ان تمام افسانوں کا مختصر جائزہ اس مضمون میں پیش کیا ہے۔

مضمون نگار کا خیال ہے کہ بیگ احساس نے افسانوں میں تمثیل کے ساتھ ساتھ تشبیہ اور علامت کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ اس کے لیے قرآن، ہندو دیو مالا اور داستانوں سے کردار مستعار لے کر انہیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے افسانوں میں پرویا گیا ہے۔

مضمون کے آخر میں زبیر عالم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سادہ تمثیل سے علامت تک بیگ احساس نے اپنا تخلیقی سفر کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ اور لکھا مجھے امید ہے کہ اردو کہانی جو ایک موڑ پر آ کر رک سی گئی ہے اسے نئی سمت اور رفتار دینے میں بیگ احساس اہم رول ادا کریں گے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
04	77	28-38	اسلم جمشید پوری	اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار	2015	اپریل	64

اس مضمون یعنی کہ ''اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار'' میں اسلم جمشید پوری نے چودہ سالوں پر محیط افسانوں کے حوالے سے سماجی اقدار کی تغیر پذیری کے اسباب بیان کیے ہیں۔ انہوں نے 2000 سے لے کر 2014 تک افسانوں کو دو زمروں میں تقسیم کر کے دیکھا ہے۔

1۔ اکیسویں صدی میں اپنا افسانوی سفر شروع کرنے والے افسانہ نگار جن میں اس مدت میں شائع ہونے والے افسانہ نگار اور اس مدت میں پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہونے والے افسانہ نگار شامل ہیں۔

2۔ دوسرا زمرہ ایسے افسانہ نگاروں کا ہے، جو 2000 سے قبل افسانوی دنیا میں مقبول ہو چکے تھے اور جو عمر کی آخری مزل پر ہیں۔

ان دونوں زمروں میں اسلم جمشید پوری نے ذکیہ مشہدی، شوکت حیات، بیگ احساس اقبال حسن آزاد، مشرف عالم ذوقی، ترنم ریاض نگار عظیم، ایم۔ مبین، نورالحسنین سے لے کر عہد جدید کے افسانہ نگار نفیس بانوں، وسیم حیدر، تسنیم فاطمہ، تبسم فاطمہ، محمد نہال افراز جیسے دیگر افسانہ نگاروں کے یہاں اکیسویں صدی کے سماجی تغیر اور تبدل کو عمدگی سے اجاگر کیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ اردو افسانے میں نئی صدی نئے تغیر پذیر سماجی کی عکاسی کا منظرنامہ خاصہ طویل ہے۔ اس پر ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں پر میں نے چند اقتباسات بھی پیش کیے ہیں جن سے نئی صدی کا تغیر پذیر سماج ہمارے سامنے آتا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
65	اپریل	2015	حیدرآباد میں اردو افسانہ (حصہ اول)	صابر علی سیوانی	39-47	77	04

''حیدرآباد میں اردو افسانہ'' صابر علی سیوانی کا ایک طویل مضمون ہے۔اس کو سب رس نے دو حصوں میں تقسیم کر کے شائع کیا ہے۔ پہلے حصے میں صابر علی سیوانی نے پہلے حیدرآباد کے علمی و ادبی پس منظر کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے ابتدائی افسانہ نگاروں کا ذکر ہے۔اس کے بعد صابر علی سیوانی نے مضمون کے ابتدا میں لکھا ہے کہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے،لیکن ان میں سے چند اہم نام مثلاً زینت ساجدہ، عاتق شاہ،محبوب حسین جگر،سری کشن سنہا،ظفر الحسن وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے اقبال متین،عوض سعید،اکرام جاوید،ابراہیم شفیق، جیلانی بانو،رضاء الجبار، رفعہ منظور الامین،محمد یوسف ساجد،طٰہٰ آفندی اور نفیسہ خان جیسے مشہور و معروف افسانہ نگاروں کی موضوعاتی اور فنی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ علم و ہنر کی سرپرستی کا سلسلہ میر محبوب علی خان کے عہد میں بھی جاری تھا۔ بعد کے ادوار میں مختلف اصناف میں حیدرآباد کے فنکاروں نے طبع آزمائی کی۔ ابتدائی دور میں شاعری،تراجم اور تحقیق و تنقید کا زور رہا لیکن رفتہ رفتہ یہاں کے تخلیقی ذہن رکھنے والے ادیبوں نے روایتی اصناف سے ہٹ کر جدید دور کے تقاضوں کی تکمیل کی خاطر افسانہ نگاری کی جانب رجوع ہوئے اور ترقی پسند تحریک کا دور آتے آتے حیدرآباد میں افسانہ نگاری کی روایت کو فروغ حاصل ہوا، جو مستقل آگے بڑھتا گیا اور نئے نئے ادیبوں نے افسانہ نگاری میں اپنے فن کا جوہر دکھایا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
66	مئی	2015	کھول دو......وجود اور ضمیر کے منتھن کا استعارہ	ابوالکلام	14-22	77	05

ابوالکلام نے اپنے مضمون ''کھول دو............ وجود اور ضمیر کے منتھن کا استعارہ'' میں منٹو کے افسانے 'کھول دو' کو ایک نئے معنی کے طور پر اپنے قاری کو متعارف کرایا ہے۔انہوں نے بتایا ہے کہ منٹو نے افسانے کے پہلے ہی صفحے پر دومرتبہ گدلے آسمان کی بات کی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اس کی اشرف المخلوقات نے اس وقت کے زماں ومکاں کے دائرے میں اتنا قہر بپا کیا تھا کہ اس کے اثرات نہ صرف اس خطے زمین پر عیاں تھے بلکہ اس کے زیر اثر اس حصے کا آسمان بھی اپنے گدلے پن سے اس قہر کی گواہی دے رہا تھا،لیکن چوں کہ منٹو معاشرے کی پیدا کردہ قنوطی صورت حال کے بطن سے اصلاح وفلاح کی خاطر رجائی صورت حال کا خالق ہے۔

لہٰذا پہلے صفحے کے تیسرے پیراگراف میں ایک بار پھر گدلے آسمان کا ذکر کرتا ہے، جہاں سراج الدین جس کے معانی دین کا چراغ اور سورج کے ہیں، کی آنکھیں سورج سے ٹکراتی ہیں، جس سے تیز روشنی اس کے وجود میں سرایت کر جاتی ہے۔نتیجتاً اس کی جدت سے اس کے منجمد ہوش وحواس پگھل کر زندگی سے دوبارہ معمور ہوجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور نئے معنی کا ذکر کیا ہے جیسے مہیب پیکر کی طرح سلسلے وار نمودار ہوتی ہیں اور انہیں کے سیاق میں سکینہ، جس کے معنی سکون کے ہیں، کے وجود کا حیاتی،عضوی اور عصبی نظام وسکون کا تانا بانا تارتار ہوجاتا ہے،جس کے زیر اثر فضا اور آسمان گدلے ہوجاتے ہیں۔میری تفہیم کے مطابق کھول دو کو سمجھنے کا ابوالکلام نے ایک نیا زاویہ پیش کیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
67	مئی	2015	حیدرآباد میں اردو افسانہ(حصہ دوم)	صابر علی سیوانی	30-42	77	05

''حیدرآباد میں اردو افسانہ'' دراصل یہ صابر علی سیوانی کا وہی مضمون ہے،جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہ اسی کا دوسرا حصہ ہے۔صابر علی سیوانی نے اس حصے میں حیدرآباد کے مشہور افسانی نگار ابراہیم جلیس کی افسانہ نگاری سے شروع کیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے متعدد افسانہ نگاروں کا نام گناتے ہوئے دور حاضر کے مشہور و معروف افسانہ نگاروں کے فن پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔اس دور کے افسانہ نگاورں میں یٰسین احمد،عفت موہانی،قدیر زماں، محمد مظہرالزماں، بیگ احساس، مجید سلیم،محمد انیس فاروقی،مقیت فاروقی،قمر جمالی،انور رشید، رشیدالدین،ولی تنویر وغیرہ کے افسانوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

مضمون کے آخر میں انہوں نے لکھا ہے کہ حیدرآبد کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تعداد بہ نسبت دوسرے اصناف مثلاً شاعری،تنقید،تحقیق کم دکھائی دیتی ہے۔ یہاں آج چند گنے چنے فکشن رائٹرس موجود ہیں۔اس معاملے میں بہار کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔آج بہار کے رائٹرس بہار میں رہ کر لکھنے والے افسانہ نگار یا ناول نویس فنکاروں کی تعداد ملک کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔حیدرآبار ہمیشہ ہی سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔علم و ادب اور فنون لطیفہ کی یہاں خوب سرپرستی ہوتی ہے۔سب سے زیادہ یہاں شاعری کو مقبولیت حاصل ہوئی اور شعرا کی سرپرستی کی وجہ سے یہ فن پروان چڑھا،لیکن شروع ہی سے افسانہ نگاری اور افسانہ نگاروں کی طرف یہاں توجہ کم دی گئی تاہم آج بھی یہاں کے فکشن نگار ملک میں اپنا ایک منفرد اور اہم مقام رکھتے ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
68	مئی	2015	قاضی عبدالستار کے افسانوں میں تہذیبی کشمکش کا المیہ	خورشید احمد	43-47	77	05

خورشید احمد کا مضمون ''قاضی عبدالستار کے افسانوں میں تہذیبی کشمکش کا المیہ'' قاضی عبدالستار کے افسانوں کو سمجھنے کا ایک نیا زاویہ ہے۔قاضی عبدالستار کا شماران چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے قصباتی زندگی اوراس زندگی کے اقدار کو اپنے افسانوں میں زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے افسانوں کا سماجی اور ثقافتی پس منظر اودھ کے جاگیردارانہ نظام کے عروج وزوال پر محیط ہے۔

قاضی عبدالستار نے اودھ کے جاگیردارانہ نظام اوراس نظام کے ٹوٹتے بکھرتے اقدار نیز بدلتے اقدار میں زمینداروں کی لاچاری، بے بسی، بھوک ،افلاس وغیرہ کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ان کے افسانوں کا کینوس اگر چہ محدود ہے مگر انہوں نے اس محدود دائرے ہی کے اندر جاگیردارانہ نظام کے تمام نشیب وفراز سے وسعت پیدا کی ہے۔

خورشید احمد کے اس مضمون کے مطابق قاضی عبدالستار نے زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے پس منظر میں انسانی رشتوں کی بدلتی تصویر کو دردانگیز پیرائے میں پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں جاگیردارانہ تہذیب کی شان وشوکت ، انانیت اور ریت و روایت کے ساتھ ساتھ بدلتے اقدار میں جاگیرداروں کی تہذیبی کشمکش اوراس کشمکش کا المیہ بہت خوبصوورتی سے پیش کیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
69	جون	2015	نیاز کی افسانہ نگاری	ف۔س۔ اعجاز	16-29	77	06

ف۔س۔اعجاز نے اپنے مضمون ''نیاز کی افسانہ نگاری'' میں نیاز فتح پوری کی افسانہ نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ نیاز فتح پوری کا شمار دورِاول کے ان چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اردو زبان میں مختصر افسانے کو متعارف کرایا اور بڑے تواتر کے ساتھ کہانیاں لکھیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر'' 1915ء میں شائع ہوا۔

اس کے بعد نیاز فتح پوری کے متعدد افسانے منظر عام پر آئے۔ ان کے افسانوں پر رومانیت کا غلبہ تھا۔ وہ حقیقت سے زیادہ رومانیت پر زور دیتے تھے۔ نیاز فتح پوری کے علمی و ادبی کارناموں کے دیگر پہلو اس قدر غالب آگئے کہ ان کی افسانوی حیثیت زیادہ اجاگر نہ ہو پاسکی۔

''نگارستان'' نیاز فتح پوری کے انشائیوں اور افسانوں کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس زمانے میں انشائیے اور افسانے میں کچھ زیادہ فرق نہیں پایا جاتا تھا۔ اس مجموعہ میں ''زائرِ محبت''، ''حمرا کا گلاب''، ''کیوپڈ و سائیکی''، ''کہکشاں کا ایک سانحہ''، محبت کی دیوار''، ''قربان گاہِ عشق''، ''ہذیانات افضال'' اور ''ایک مصلح بت تراش'' یہ اٹھ افسانے شامل تھے۔

نیاز فتح پوری نے کلاسکیت اور کلاسک کو اردو میں پہلی بار اپنے بعض افسانوں میں ان کے اصل نظریاتی مفہوم میں برتا ہے۔ ان کی بعض کہانیاں مغربی ادب سے اخذ کردہ ہیں، جن میں یونانی اور رومی معیارت کی پاسداری اس طرح کی گئی ہے کہ نہ صرف عام فضا بندی بلکہ قصہ طرازی میں بھی تقلید کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
06	77	26-31	روبینہ تبسم	قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں مشترکہ تہذیبی عناصر	2015	جون	70

روبینہ تبسم نے اپنے اس مضمون ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں مشترکہ تہذیبی عناصر'' قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ہندو مسلم تہذیب پر راشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے تو بہت سے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں مشترکہ تہذیبی عناصر کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔لیکن مشترکہ تہذیب کی جھلک سب سے زیادہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ''جلا وطن''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''فقیروں کی پہاڑی''، ''نظارہ درمیاں ہے''، ''دریں گرد سوارے باشد'' اور ''کہرے کے پیچھے'' وغیرہ میں محض ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے وجود اور ان کے خاتمے ہی کا مرثیہ نہیں ہیں بلکہ ان کی وسعت وتنوع اس سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ یہ افسانے جہاں ایک جانب ہندو مسلم اتحاد، اتفاق اور یگانت کی مثالیں ہیں وہیں دوسری طرف اس میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اٹیلین وغیرہ تہذیب بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس طرح قرۃ العین حیدر کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس مشترکہ تہذیب کو آفاقیت عطا کی ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ وہ مختلف نسوانی کرداروں کی زندگیوں کی صرف دکھ بھری داستان ہی بیان نہیں کرتیں بلکہ اس کے ذریعے وہ تہذیبی اقدار کو بھی پیش کرتی ہیں اور ان کو ہندو مسلم اتحاد و اتفاق میں تبدیل کرتی ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
06	77	74-79	علی احمد فاطمی	عبدالصمد کے منتخب افسانے: ایک سرسری جائزہ	2015	جون	71

عبدالصمد نے جس دور سے لکھنا شروع کیا وہ نہ صرف جدیدیت کا دور تھا بلکہ اس میں جدیدیت کا بول بالا بھی تھا اور ہر دوسرا ادیب جدیدیت کے سائے تلے آنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔عبدالصمد نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا مختصر اردو افسانے سے کی تھی ان کی پہلی کہانی ''جھوٹ کی سزا'' ادبی رسالہ ''غنچہ'' میں 1961 میں شائع ہوئی۔ 1967 میں ان کا ایک افسانہ ''ایک مرغ'' رسالہ ''آئندہ'' جمشید پور میں شائع ہوا۔

علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون ''عبدالصمد کے منتخب افسانے: ایک سرسری جائزہ'' میں عبدالصمد کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ عبدالصمد کی کہانیاں مختلف نوعیت کی ہیں جہاں واقعہ سپاٹ انداز میں صرف واقعہ نہیں رہتا بلکہ واقعات کے پیچھے انسان کی زندگی اور اس کی پیچیدگی بلکہ ژولیدگی واقعہ کو تجربہ بھی نہیں بلکہ مسئلہ بنا کر پیش کرتی ہے۔

انسان اپنی ترقی اور خوشحالی کے لیے گاؤں دیہات چھوڑ کر محنت و مشقت کر کے کیا کیا کارنامے انجام دیتا ہے لیکن نشاط کار کی یہ ہوس اسے اکثر اس منزل پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں سے بت شمار توہمات اور رسومات اسے گھیر لیتے ہیں۔اچھی بات یہ ہے کہ عبدالصمد کی کہانیاں کسی کردار، کسی عمل و حرکت میں بالواسطہ یا بلا واسطہ زندگی سے الگ نہیں ہوتی ہے۔ان کا دائرہ فکر و عمل، خواب اور شکست خواب سے جنم لیتا ہے اور زندگی پر آ کر ختم ہوتا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
07	77	8-14	نظام صدیقی	نئے عہد کی تخلیقیت میں منٹو کی نئی بازیافت	2015	جولائی	72

نظام احمد صدیقی نے اپنے مضمون ''نئے عہد کی تخلیقیت میں منٹو کی نئی بازیافت'' میں منٹو کے تیئں بدلتے نظریات اور دورحاضر میں منٹو کی طرز پر لکھے گئے افسانوں پر بہت اچھی گفتگو کی ہے۔منٹو کے مختصر افسانوی بیانیہ میں جنس ہی وہ بنیادی زندہ، نامیاتی اور متحرک تخلیقی توانائی ہے جو آہستہ آہستہ ارتفاع کر بھی مجازی عشق، کبھی حقیقی عشق اور بالآخر شاذونادر شاہدانہ شعوروآگہی میں منقلب ہوجاتی ہے۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ منٹو کی تخلیقی افسانوی کائنات میں جنس آگ ہے۔تاہم روایتی معنوں میں منٹو نہ نوری ہے اور نہ ناری ہے۔ یہ نئی ہمہ پہلو افسانوی تخلیقیت اور معنویت ہر نوعیت کی مشروطیت کے لیے آج بھی نیا چیلینج ہے اور نئے عہد میں چیلنج بنی رہے گی۔

مضمون کے آخر میں نظام صدیقی لکھا ہے کہ منٹو کے منتخب شاہکار افسانے بیک وقت وجودیاتی اور کائناتی گہرائی کی پیچیدگیوں اور مخفی تاریکیوں سے گزرے ہوئے انسانی تقدیر کی بابت روشنی مزید روشنی کے متلاشی ہیں اور انسانیت کی غیر انسانیت سامراج میں بے نام انسانیت کے داعی بھی ہیں۔منٹو کی افسانوی جمالیات اور قدریات شدید چیلنج کی باغیانہ حسیات اور نو انسانیات ہے۔المختصر صحیح معنوں میں منٹو اردو افسانہ نگاری کے پہلے حقیقت پسند مختصر بیانیہ نگار ہیں جنہوں نے طوائف کی زندگی سے سچائی کا پردہ اٹھایا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
73	جولائی	2015	حقیقت پسندانہ تحریروں کا افسانوی مجموعہ ''لمس''	معین الدین عثمانی	73-75	77	07

معین الدین عثمانی نے مذکورہ مضمون ''حقیقت پسندانہ تحریروں کا افسانوی مجموعہ لمس'' میں ایم مبین کی افسانہ نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔اس مضمون میں ایم۔مبین کے افسانی مجموعے ''لمس'' پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں تک متذکرہ مجموعہ کے افسانوں کے موضوعات کا معاملہ ہے تو زیادہ تر مشمولہ افسانوں کے موضوعات شہری زندگی کے متعلق ہی ہے۔اتفاق یہ بھی ہے کہ کہ سابقہ مجموعوں کے موضوعات بھی شہری زندگی کے اطراف ہی سے چنے گئے تھے۔یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی قباحت نہ ہوگی کہ ایم۔مبین نے شہری زندگی کو مرکزی موضوع کے تحت برتا ہے، جو ان کی حقیقت پسندانہ سوچ کا مظہر ہے۔ ''لمس'' کے توسط سے ایم۔مبین کا یہ پڑاؤ اس لیے بھی اہمیت اور توجہ کا متقاضی ہے کہ خصوصی اور موضوعی نوعیت کے افسانوں کا حامل اتنا ضخیم مجموعہ غالباً ریاست کا اولین مجموعہ ہے، جو اپنے دیدہ زیب سرورق اور عمدہ گیٹ اپ کے سبب قاری کو متوجہ کرنے میں حد درجہ کامیاں ہے

آخر میں معین الدین عثمانی نے لکھا ہے کہ ایم۔مبین نے اپنی کہانیوں میں ممبئی میں رہنے والوں کے بینادی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ممبئی میں رہائشی مسئلہ بے حد اہم ہے۔وہاں کے لیے کہا جاتا ہے کہ ممبئی میں کوئی بھی آدمی بھوکے پیٹ نہیں سوئے گا لیکن سوئے گا کہاں یہ معلوم نہیں ہوتا۔افسانہ 'دہشت' میں اسی مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔اسی طرح ممبئی میں پیش آنے والے مسائل سے ایم۔مبین اپنی کہانیوں کا خمیر تیار کرتے ہیں اور اسے اپنے تخیل کی بھٹی میں پکا کر قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
08	77	36-43	عبدالقوی	بیدی کے افسانوں میں اساطیری علائم	2015	اگست	74

عبدالقوی نے اپنے مضمون ''بیدی کے افسانوں میں اساطیری علائم'' میں بیدی کے افسانوں میں ہوئے اساطیر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیدی نے اپنے افسانوں کا موضوع اپنے گردوپیش کی زندگی سے لیا ہے۔ ان کے یہاں نفسیاتی کشمکش اور رومانیت کے اچھے نمونے ملتے ہیں مگر جو چیز ان کے افسانوں کو افسانہ بناتی ہے وہ ہے ان کے ماحول کی عکاسی۔ انہوں نے خانگی زندگی کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ شاید ہی کسی نے ایسا کھینچا ہو۔ ان کی بہترین مثال گرم کوٹ'' ہے۔ جس میں متوسط طبقے کی رہائش کا بیان ہے۔ اس میں ہندوستانی بیوی کی سچی محبت اور ہمدردی کی تصویر دکھائی پڑتی ہے۔

عبدالحق قوی کا کہنا ہے کہ اسی طرح بیدی کے افسانے ''چھوکری کی لوٹ''، ''آلو''، ''رحمٰن کے جوتے''، ہڈیاں اور پھول''، ''دس منٹ بارش میں'' وغیرہ متوسط طبقے کے ترجمان ہیں۔ بیدی اپنی تہذیب میں مکمل طور پر گندھا ہوا افسانہ نگار رہے۔ ان کے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب کا جوہر اساطیری حوالوں سے پوری طرح منعکس ہوتا ہے۔ انہوں نے اساطیر کے آئینے میں قدیم ہندوستان کی اس روح کو دیکھا ہے ، جو آج بھی مذہبی اور دیگر رسم ورواج کے اندر زندہ ہے۔

آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ بیدی کے افسانوں میں اساطیری پہلو خوب دیکھے جا سکتے ہیں۔ بیدی نے ہندوستانی اساطیر کا عمیق مطالعہ کیا اور جب ان اساطیر کو اپنی تخلیق کا حصہ بنایا تو یہ محض علم نہ رہا بلکہ تخلیق کے اندر پورے حسن کے ساتھ سموتا چلا گیا۔ اس طرح بیدی کے اساطیری افسانوں پر بھی غیر اساطیر ی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ وہ اوپر کی سطح پر ترقی پسند رویے سے اور باطن کی سطح پر اساطیری مابعد الطبیعیات سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
75	اگست	2015	عصمت چغتائی کے افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری	محمد سلیم خان	44-48	77	08

مضمون ''عصمت چغتائی کے افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری'' میں محمد سلیم نے عصمت چغتائی کے افسانوں میں جنسی پہلو کو اجاگر کیا ہے۔عصمت چغتائی نے سب سے پہلے افسانوں میں جنسی پہلو کو کھل کر پیش کیا ہے۔عصمت چغتائی بے باک افسانہ نگار تھیں۔انہوں نے اردو افسانے کو ایک نیا موڑ دیا اور عورتوں کی تعلیم اور مسلم معاشرے کے مخصوص مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اسے اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے قاری کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ دور جا چکا ہے جب عورتیں جاہل رکھی جاتی تھی۔انہیں کھانا پکانے، سینے پرونے اور بچوں کو کھلانے کے علاوہ کچھ کام نہیں آتا تھا۔

عصمت چغتائی پہلی خواتین افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے سماجی حقیقت نگاری کے علاوہ جنسی حقیقت نگاری کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔عصمت چغتائی کو افسانے کے فن اور زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی، جس کی بنا پر انہیں فکشن نگاری میں شہرت و مقبولت حاصل ہوئی۔انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کو موضوع بنا کر سماج کی ان گندگیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے، جو عام افسانہ نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔

مضمون نگار کے مطابق عصمت چغتائی کے زیادہ تر افسانوں مثلاً ''لحاف''، ''ایک بات''، ''کنواری''، ''چوتھی کا جوڑا'' وغیرہ میں جنسی حقیقت نگاری کو دیکھا جا سکتا ہے۔عصمت چغتائی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کی سچائیوں کی تصویر پیش کرنے میں اچھائیوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ برائیوں کو بھی پیش کرنے میں ذرا بھی نہیں گھبراتی ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
09	77	52-54	محمد نظام الدین	راجندر سنگھ بیدی کا اسلوب	2015	ستمبر	76

محمد نظام الدین نے اپنے مضمون ''راجندر سنگھ بیدی کا اسلوب'' میں بیدی کے افسانوں کے حوالے سے ان کے اسلوب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے اسلوب اور طرز نگارش مسلسل ریاضت اور گہرے تفکر کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ راجندر سنگھ بیدی کے ہم عصروں میں کرشن چندر اپنے شعری اور رومانی اسلوب کے سبب سب کی نگاہوں کے مرکز تھے۔ دوسری جانب سعادت حسن منٹو اپنی ادبی جدت اور سفاکانہ حقیقت نگاری کی بنا پر ہر خاص و عام کی زبان کا ذائقہ بنے ہوئے تھے۔ ایسی صورت حال میں راجندر سنگھ بیدی کے لیے اپنی ایک الگ شناخت بنانا اور ایک منفرد اسلوب اختیار کرنا ایک مشکل ترین عمل تھا۔ لیکن بیدی نے ہمت نہیں ہاری اور ریاضت اور محنت جاری رکھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی ایک منفرد اسلوب کے مالک بن بیٹھے۔

محمد نظام الدین کے لکھا ہے کہ بیدی نے اپنے افسانے کے اظہار کے لیے جس طرز بیان، طریقہ اور اسلوب کا سہارا لیا ہے وہ گہرا رچاؤ اور گمبھیرتا کا حامل ہے، کیوں کہ اسلوب ایک ایسا طرز بیان اور طرز تحریر ہے جس میں تخلیق کار اپنے داخلی اور خارجی عوامل کو ایک دلکش اور مؤثر پیش کش کی صورت میں اپنے قاری کے روبرو ہوتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا اسلوب بھی جاذب نظر اور پر کشش ہے، جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔

محمد نظام الدین کے اس مضمون کے مطابق راجندر سنگھ بیدی کا اسلوب بیانیہ ہے۔ بیدی موضوعات کا انتخاب فکری بنیادوں پر کرتے ہیں اور بڑی چابکدستی وفنی شائستگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ بیدی نے اپنے اسلوب سے ایک عہد کو متاثر کیا ہے، لیکن ان کے اسلوب کی پیروی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
10	77	28-36	حامد رضا صدیقی	ممتاز مفتی بحیثیت افسانہ نگار: ایک تنقیدی مطالعہ	2015	اکتوبر	77

حامد رضا صدیقی نے اپنے اس مضمون میں ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ممتاز مفتی کے بیشتر افسانے جنسی حقیقت نگاری کو بیان کرتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام اور ممتاز مفتی کے پہلے افسانے ''جھکی جھکی آنکھیں'' کی اشاعت کا سال ایک ہی ہے، یعنی 1936۔ ان کا یہ افسانہ ادبی دنیا کے سالنامے میں پیش ہوا۔ یہیں سے ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ممتاز مفتی نے عورت اور مرد دونوں کی نفسیات باہمی رومانی تعلق میں جنس کی کارفرمائی کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ جنس اور جنسی نفسیات ممتاز مفتی کا مرغوب ترین موضوع ہے۔ جنس اور اس کی خواہش ہماری فطرت اور جبلت میں شامل ہے، لیکن ہم معاشرتی اور سماجی طور پر ایک ایسے نظام اور روایت کا حصہ ہیں، جہاں اس کا ذکر تک شرافتوں کے نام نہاد معیار کے منافی ہے۔ نتیجہ جبر اور گھٹن مختلف ذہنی اور نفسیاتی عوارض اور ابنارمل حرکات وسکنات کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری کا یہی پہلو نمایاں ہے۔

حامد رضا صدیقی آخر میں لکھتے ہیں کہ اس کے علاوہ ممتاز مفتی کے افسانوں کے کردار جس سماج کے نمائندے ہیں ان کے طرز عمل سے اس سماج کا تجزیہ کرنا چنداں مشکل نہیں ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کا ایک نمایاں موضوع اس کلچر کی عکاسی ہے، جس کا ہماری زمین، روایات اور لوک ورثے سے کوئی تعلق نہیں، جسے مغربی فیشن اور صنعتی انقلاب نے جنم دیا ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانے اس صورت حال کو بڑے معنی خیز انداز میں بے نقاب کرتے ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
10	77	37-44	عبدالرحمٰن	’’یوکلپٹس‘‘ایک تجزیاتی جائزہ	2015	اکتوبر	78

اس مضمون میں عبدالرحمٰن نے ’’یوکلپٹس‘‘ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔’’یوکلپٹس‘‘ راجندر سنگھ بیدی کا ایک مشہور افسانہ ہے۔عورت بیدی کا پسندیدہ موضوع ہے۔اس پر انہوں نے متعدد افسانے لکھے ہیں۔ انہیں میں سے ایک افسانہ’’یوکلپٹس‘‘ بھی ہے اور اس کا موضوع بھی عورت ہی ہے۔اس افسانے میں تین نسوانی کرداروں کے ارد گرد کہانی تشکیل دی گئی ہے۔

عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ افسانے کی ابتدا راوی کے ذریعے ایک صورت حال کے بیان سے ہوتی ہے۔جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لمحوں کے گزر جانے یا ایک دوسرے پر ڈھیر ہونے سے مٹی کا ٹیلا بنتا ہے۔مٹی کے ڈھیر ہونے کا بیان لمحوں کے گزر جانے کے حوالے سے کیا گیا ہے۔گویا’’مٹی کا ڈھیر‘‘ گزرے ہوئے ماہ و سال کا کنایہ ہے،جس سے یوکلپٹس کا درخت نکلتا ہے۔

عبدالرحمٰن کا کہنا ہے کہ افسانہ نگار اس صورت حال کے بیان سے ہی قاری کے ذہن میں سوالات قائم کر کے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔مثلاً لمحوں کے ایک دوسرے پر ڈھیر ہونے سے مٹی کا ٹیلا بننے میں کیا ربط ہے؟اور پھر لمحوں کے ذریعے بنائے گئے ٹیلے سے’یوکلپٹس‘‘ کا درخت نمود پاتا ہے۔یہ سوالات قاری کے ذہن میں افسانے کے عنوان سے متعلق بھی دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
10	77	45-48	محبوب ثاقب	انگارے:تفہیم وتجزیہ	2015	اکتوبر	79

محبوب ثاقب نے اس مضمون میں انگارے کی تفہیم و تجزیہ پیش کیا ہے۔سجاد ظہیر،محمود الظفر ،احمد علی اور رشید جہاں کے افسانوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ ''انگارے'' 1932ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں نو افسانے اور ایک ڈراما شامل ہے۔اس میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے ،رشید جہاں کا ایک افسانہ اور ایک ڈراما،احمد علی کی دو افسانے اور محموالظفر کا ایک افسانہ شامل ہے۔

محبوب ثاقب کے مطابق ان فسانوں اور ڈارمے کا عنوان اس طرح ہے۔ نیند نہیں آتی (سجاد ظہیر)، جنت کی بشارت (سجاد ظہیر)، گرمیوں کی ایک رات (سجاد ظہیر)، دُلاری (سجاد ظہیر)، پھر یہ ہنگامہ(سجاد ظہیر)، بادل نہیں آتے (احمد علی)،مہاوٹوں کی ایک رات(احمد علی)،دلی کی سیر(رشید جہاں)،پردے کے پیچھے(رشید جہاں)اور جواں مردی(محموالظفر)۔

محبوب ثاقب نے ان تمام افسانوں کا بہت گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کا تجزیہ اس مضمون میں کیا ہے۔اس مجموعے میں سماجی ،سیاسی ،معاشی یا معاشرتی ہر قسم کی زیادتی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کے سرکار نے اس مجموعے کو ضبط کر لیا تھا۔اردو کے منضبط افسانوی مجموعوں میں ''سوز وطن'' اور''انگارے'' تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔اولذکر کو حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے کے جرم میں ضبط کیا گیا اور آخرالذکر کو عریانی اور فحاشی کے جرم میں نذر آتش کیا گیا۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
11	77	19-27	احمد رشید	شافع قدوائی کی شخصیت اور افسانے کی صنفی تنقید	2015	نومبر	80

اس مضمون ''شافع قدوائی کی شخصیت اور افسانے کی صنفی تنقید'' میں احمد رشید نے شافع قدوائی کی شخصیت پر بات کرنے کے بعد ان کی افسانوی تنقید پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔

احمد رشید کا کہنا ہے کہ شافع قدوائی فکشن کو نظری اور عملی پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔ وہ فکشن تنقید کو نئے رجحانات اور میلانات سے آشنا کرتے ہوئے عالمی تناظر میں اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ اسلوبیاتی تنقید، جدید اور مابعد جدید تنقید کے پس منظر میں فرسودہ تنقید نگاری کے تصور سے انکار کرتے ہوئے بین المتونیت کی تلاش کے حامی ہیں اور افسانوی نظم میں تہدار اور ترفع ہونے کا اصرار کرتے ہیں۔

اح، د رشید نے اس مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ شافع قدوائی کی تنقیدی زبان سے بیش تر نقادین کو اعتراض ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مغربی رجحانات، عالمی افکار و نظریات، نئے نئے علوم سے آگہی اور نئی نئی اصطلاحات، جو ان کی تحریر میں در آتی ہیں ان کے مفاہیم کی جانکاری ہونا بھی ضروری ہے۔ تب ہی ان کے مضامین کے پوشیدہ معنوں سے آگاہی ہوگی۔

احمد رشید آخر میں لکھتے ہیں کہ آزبان اگر ایک تخلیقی عمل ہے تو تنقید بھی اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے بہر حال ایک تخلیق ہوتی ہے اور جو زبان وہ تنقید کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کی صنفی تنقید میں شافع قدوائی کی ایک الگ شناخت بن چکی ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
81	دسمبر	2015	افسانہ، تخلیقی اظہار اور خیال کا ارتقا	ابوبکر عباد	29-35	77	12

اس مضمون میں ابوبکر عباد نے افسانے کی تخلیقی اظہار اور اس کے خیال کے ارتقا کو پیش کیا ہے۔ تخلیق کی اصطلاح ہمارے یہاں وسیع مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تخلیق میں کوئی فکر، کوئی تصور، تخیل یا زندگی کے تجربات و مشاہدات کا اثر انگیز بیان بھی ہوتا ہے۔

ابوبکر عباد کا کہنا ہے کہ افسانہ ایک ایسی بیانیہ تخلیق ہے، جس میں ایک یا ایک سے زائد کرداروں کے حوالے سے کوئی واقعہ یا واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کسی واقعے کو عام لوگوں کی طرح جوں کا توں بیان نہیں کر دیتا بلکہ اصل زندگی میں رونما ہو چکے واقعے کو وہ نئے سرے سے تخلیق کرتا ہے یا کوئی ایسا واقعہ خلق کرتا ہے، جو اصل زندگی میں سرے سے واقع ہوا ہی نہ ہو، لیکن اس کے وقوع کے امکان یا گمان سے انکار نہ کیا جا سکتا ہو۔ اسی طرح وہ واقعے میں شامل کردار اور بیان کی زبان کو بھی اس کے ماحول و معیار کے لحاظ سے از سرِ نو خلق کرتا ہے۔

ابوبکر عباد نے یہ بھی لکھا ہے کہ افسانے میں جب کوئی واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے تو اس کا تعلق کسی زمانے اور کسی مقام سے ضرور ہوتا ہے۔ یعنی کوئی جگہ ہوگی جہاں واقعہ رونما ہوا ہوگا اور اس رونما ہونے کا کوئی وقت بھی ہوگا۔ اسے ہم زماں و مکاں کہتے ہیں۔ یہ وقعہ کسی کے ساتھ پیش آیا ہوگا، مثلاً انسان، جاندار یا غیر جاندار کے ساتھ، یہ کردار ہوا۔ افسانے کا میڈیم چونکہ زبان ہے اس لیے واقعے کو بیان کیا جائے اور جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے گا تو اس بیان کا آغاز بھی ہوگا اور انجام بھی۔ اسے ارتقا کہتے ہیں۔

ابوبکر عباد آخر میں لکھتے ہیں کہ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ افسانے میں ہمیشہ واقعے کا ہی بیان ہوتا ہے۔ لیکن نہ بھولنا چاہیے کہ جس بیان میں افعال کا استعمال ہوگا وہی افسانے کا ارتقائی خیال ہوگا۔ المختصر ابوبکر اعباد نے افسانے کی تخلیقی اظہار اور خیال کے ارتقا کو اس مضمون میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
82	دسمبر	2015	ابراہیم جلیس: شخصیت اورفن	اسود گوہر	41-44	77	12

اس مضمون میں اسود گوہر نے مشہور افسانہ نگار ابراہیم جلیس کی شخصیت اور فن پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ابراہیم جلیس کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی پیدائش 11 راگست 1923ء کو ہوئی۔ ان کا پہلا افسانہ ''رشتہ'' کے عنوان سے رسالہ ساقی میں شائع ہوا۔ انہوں نے اردو ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں افسانہ، ناول، ڈارما، رپورتاز اور طنزیہ مضامین شامل ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''زرد چہرے''' نے انہیں بہت شہرت بخشی۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ لیکن انہیں انقلابی شہرت ان کے افسانوی مجموعے ''چالیس کروڑ بھکاری'' سے حاصل ہوئی۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ابراہیم جلیس کی تحریروں میں شگفتہ نگاری، اسلوب کی انفرادیت، تہداری اور بہترین انشاء پردازی کا مرکب نظر آتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہمہ جہت رنگوں کو اپنی تحریروں میں برتا ہے۔ انسانی نفسیات کا احوال بھی ان کی تحریروں میں نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم مقصد عوام کے دکھ درد میں ان کے ساتھ شامل ہوکر ان کی تکلیفوں کو حل کرنا ہوتا تھا۔

آخر میں اسود گوہر لکھتی ہیں کہ ابراہیم جلیس کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ ان کا افسانوی اسلوب متنوع ہے، جس میں بہت سی خصوصیات موجود ہیں۔ انہوں نے انگریزی کے الفاظ کو بھی اس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ وہ اردو کے ہی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ یہی ابراہیم جلیس کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
03	78	22-24	مشتاق صدف	انتظار حسین: اردو فکشن کا ایک روشن ستارہ	2016	مارچ	83

مشتاق صدف نے یہ مضمون انتظار حسین کے انتقال کے بعد لکھا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ 2/ فروری 2016 کو ریوتی شرن شرما کا جب فون آیا اور انہوں نے گلوگیر آواز میں انتظار حسین کے انتقال کی مجھے اطلاع دی تو مجھے بھی یقین نہیں آیا۔ وہ کچھ دنوں سے بیمار ضرور تھے لیکن یہ بات ذہین و دماغ میں بھی نہیں تھی کہ ان کے اٹھ جانے کی خبر سننے کو ملے گی۔ انتظار حسین اب ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کی روشن لکیریں ایسی ہیں جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

مضمون نگار نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ دراصل انتظار حسین کی موت کے ساتھ فکشن کی ایک صدی خاموش ہوگئی۔ انتظار حسین نے اپنی کہانیوں کو ''جنم کہانیاں'' اور ''قصہ کہانیاں'' کا نام دیا۔ جب ان کہانیوں کو لمبی عمر ملی یعنی کہانیاں طویل ہوئیں تو وہ ''بستی''، ''تذکرہ''، ''چاند گہن''، ''آگے سمندر ہے'' جیسے ناموں سے منظر عام پر آئیں۔ انہوں نے ''خیمے سے دور'' زندگی کو آباد کیا۔ ''زمیں اور فلک'' اپنی زندگی کے نشیب وفراز کو بیان کیا۔ ''آخری آدمی''، ''کوآواز بھی دی''، ''کنکری'' سے انسانی بھید کو سمجھا۔ ''خالی پنجرہ''، ''گلی کوچے''، ''شہر افسوس''، شہزادے کے نام''، ''جستجو کیا ہے'' جیسی تخلیقات اردو ادب کو دیں۔

مشتاق صدف نے اپنے اس مضمون میں انتظار حسین کی انہیں ادبی کاوشوں کی بنا پر انہیں اردو فکشن کا روشن ستارہ قرار دیا ہے اور ان پر سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
03	78	25-31	توصیف مجید لون	دیپک بدکی کے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی	2016	مارچ	84

توصیف خان نے اس مضمون میں دیپک بدکی کے افسانوں میں کشمیری کی عکاسی کا جائزہ پیش کیا ہے۔دیپک کمار بدکی کشمیر کے تاریخی شہر سری نگر میں پیدا ہوئے۔ان کے تعلیمی سفر کا آغاز ایک جبری اسکول سے ہوا،جس کا سلسلہ بہت عرصہ پہلے مہاراجہ ہری سنگھ نے مقامی لوگوں میں تعلیم عام کرنے کی غرض سے شروع کیا تھا۔

توصیف خان کے مطابق دیپک بدکی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ'سلمیٰ' سے کیا،جو سری نگر کے روزنامہ'ہمدرد' میں دوقسطوں میں شائع ہوا تھا۔1974 میں دیپک بدکی کا ایک افسانہ'ریزے' دوردرشن سری نگر سے ایک پروگرام کے تحت ٹیلی کاسٹ ہوا۔پھران کی کہانیاں رفتار،رگ سنگ،گنگ وجمن،تعمیر وغیرہ میں شائع ہونے لگیں۔دیپک بدکی کے اب تک چھ افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔جن کے نام''ادھورے چہرے''،''چنار کے پنجے''،''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی''،''ریزہ ریزہ حیات''،''روح کا کرب'' اور''مٹھی بھر ریت''ہیں۔

توصیف خان یہ بھی لکھتے ہیں کہ دیپک بدکی کے مجموعوں میں شامل کہانیاں دراصل کشمیر کی کہانیاں ہیں۔کیوں کہ ان کے بچپن،لڑکپن اور جوانی کا بیشتر حصہ اسی وادی میں گزرا ہے۔اس لیے اس علاقے کی ملی جلی تہذیب،اس کے رنگا رنگ قدرتی مناظر،شعروادب کی اعلیٰ روایات اور پرسکوں ماحول سے ان کا جذباتی رشتہ قائم رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانوں میں وادیٔ کشمیر کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
85	اپریل	2016	افسانہ کے تنِ نازک کو سنوارنے والا فن کار ''رتن سنگھ''	صغیر افراہیم	23-28	78	04

صغیر افراہیم نے لکھا ہے کہ بلا شبہ رتن سنگھ ایک ایسے فنکار ہیں، جنہوں نے افسانہ نگاری کے موضوعات میں جدت پیدا کی ہے۔صغیر افراہیم نے اپنے اس مضمون میں تن سنگھ کی جدت کو اجاگر کیا ہے۔ رتن سنگھ نے افسانوی دنیا میں 1955 میں قدم رکھا تھا۔اسی وجہ سے ترقی پسند افکار و نظریات کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بیشتر خوبیاں ان کے فن میں ڈھلتی چلی گئیں۔''پہلی آواز''، ''پنجرے کا آدمی''، ''کاٹھ کا گھوڑا''، ''پناہ گاہ''، ''پانی پہ لکھا نام'' وغیرہ رتن سنگھ کے افسانوی مجموعے ہیں۔

صغیر افراہیم کا کہنا ہے کہ رتن سنگھ فالتو جملے سے بہت گریز کرتے تھے۔اس لیے فضا اور ماحول کے مناظر کم از کم ہوتے ہیں۔البتہ پہلے جملے یا پہلے پیراگراف سے جدت اور ندرت ظاہر ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نیا تجربہ کر رہا ہے۔لطیف و نازک جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کرنے والے نمائندہ افسانے پناہ گاہ، ایک لمحہ کا خدا، سنی سنائی بات، روپ متی کی گپھائیں، قرار دیے جاسکتے ہیں۔کیوں کہ ان میں زندگی کو بدلنے کا فن نظر آتا ہے۔وہ خود کہتے ہیں کہ جو آرٹ زندگی کو خوبصورت بناتا ہے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

صغیر افراہیم آخر میں لکھتے ہیں کہ زندگی کے نبض کو ٹٹولنے والے افسانہ نگار رتن سنگھ فکشن کی باریکیوں اور نزاکتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔انہوں نے فنی اور تکنیکی سطح پر کامیاب فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ایجاز و اختصار اور معنی کی تہہ داری ان کے ادب پاروں کی اہم خوبیاں ہیں۔دریا کو کوزہ میں اور ساگر کو گاگر میں بھرنے کے فن میں انہیں کمال حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ فکشن کی دنیا میں وہ اپنی ایک الگ پہچان بناتے ہوئے اعتبار حاصل کیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
86	اپریل	2016	عابد سہیل کی افسانوی کائنات	فیروز عالم	33-40	78	04

عابد سہیل کا شمار ہمارے عہد کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے کم لکھا لیکن معیاری تخلیقات پیش کیں۔خواہ وہ افسانے ہوں، خاکہ ہو یا تنقید۔ان کے صرف دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ ''جینے والے'' اور ''غلام گردش''۔ پہلے مجموعے یعنی ''جینے والے'' میں کل چودہ افسانے شامل ہیں۔اور دوسرے مجموعے میں ''غلام گردش'' میں گیارہ افسانے ہیں۔

مضمون نگار کہا کہنا ہے کہ عابد سہیل کا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ان کے افسانے پڑھتے وقت قاری مختلف کیفیات سے گزرتا ہے۔انہوں نے روزمرہ زندگی کے عام مسائل پر اپنے افسانوں کی بنیاد رکھی ہے۔اقدار کی شکست و ریخت،انسان کی مجبوری اور بے بسی،غریبی اور بے روزگاری،فرقہ واریت، بدعنوانی،اخلاقی زوال،ریاکاری اور جانوروں سے بدتر انسانی زندگی کی حقیقی تصویریں ان کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔

فیروز عالم نے لکھا ہے کہ عابد سہیل نے سماج کے نچلے طبقے کے حالات و مسائل کو خاص طور سے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔انہوں نے بہت فنکاری کے ساتھ اپنے کرداروں کو سچویشن کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ان کی کہانیاں پڑھتے وقت کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنا نظریہ قاری پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ان کے تمام افسانے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ان کے تقریباً ہر افسانے کا آخری پیرا گراف یا جملہ پورے افسانے کی کلید کی حیثیت رکھتا ہے،یہی عابد سہیل کی افسانوی کائنات ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
04	78	68-71	احمد رشید	اور کیا ہے نیا، کہانی میں......ایک تجزیاتی مطالعہ	2016	اپریل	87

’’اور کیا ہے نیا، کہانی میں‘‘ عارف خورشید کا افسانوی مجموعہ ہے۔ احمد رشید نے اس مجموعے میں شامل تمام افسانوں کا اس مضمون میں تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ پانچ افسانوں، ایک سو اکتالیس افسانچوں پر مشتمل اس کتاب میں دو خاکے، سات تبصرے، دو افسانوں کے تجزیے اور ثلاثی پر ایک مضمون بھی شامل ہے۔

احمد رشید نے لکھا ہے ’’دل ہوا ہے چراغ‘‘ اور ’’قید میں ہے بلبل‘‘ دونوں افسانوں کا مرکزی کردار عورت ہے۔ عورت کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ان میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اولذکر کہانی میں اس کے جذبۂ ایثار، پاکیزگی، عظمت وطہارت، اس کی خدمت گزاری پر مر مٹنے والا شوہر، جو اس کی محبت اور وفا میں سرشار ہے۔ اپنے شریک حیات کے ساتھ گزارے غم وخوشی کا ایک ایک لمحہ زندگی کی کتاب میں محفوظ ہے کو یاد کرتا ہے، لیکن ’’قید میں ہے بلبل‘‘ میں عورت کی شخصیت کا متضاد پہلو نظر آتا ہے، جس کے کردار کی مختلف جھلکیاں مکالمہ کے ذریعے پیش کی گئی ہیں، جو ٹیلی فون پر بات چیت کی تکنیک پر منحصر ہے۔

مضمون کے آخر میں احمد رشید لکھتے ہیں کہ جنس صرف جسمانی لذت کا نام نہیں ہے۔ اس میں تقدیس وتحریم کا پہلو بھی چھپا ہے۔ فطرتِ انسانی کا جذبہ جب نا آسودگی کا شکار ہوتا ہے تو زندگی میں کیسے کیسے کلائمکس پیدا ہو جاتے ہیں۔ ’’آگ رکھی ہے سر پر‘‘ افسانہ اس کا غماز ہے۔ یہاں شمع سے نفرت کے بجائے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح احمد رشید نے افسانوی مجموعہ ’’اور کیا ہے نیا، کہانی میں‘‘ شامل تمام افسانوں اور افسانچوں کا بڑی خوبی کے ساتھ تجزیہ پیش کیا ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
88	جولائی	2016	نئے افسانے میں موضوعاتی تنوع	محمد غالب نشتر	34-40	78	07

محمد غالب نشتر اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں نے بدلتی ہوئی سماج کی مکمل عکاسی کی ہے۔ان کے موضوعات ذات کے کرب اور استحصالی نظام تک محدود نہیں رہے بلکہ ہر اس موضوع کو اپنا لیا جس کا تعلق انسان اور انسانیت سے ہے۔ چونکہ اکیسویں صدی تک آتے آتے انسان نے مختلف جہات میں کافی ترقی کر لی ہے،سوچ وفکر میں ایک نمایاں تبدیلی آئی ہے،انسان اپنی منزل مقصود کے حصول میں غیر انسانی عمل بھی اختیار کرنے میں دریغ نہیں کر رہا ہے،انسان صاحب ثروت اور صاحب منصب بننے کے تگ و دو میں انسانی اقدار اور ملکی سالمیت کو مسمار کرتا نظر آ رہا ہے۔موروثی اور خاندانی تہذیبیں پامال ہو رہی ہیں،مشرقی قدریں مغرب کے منفی اثرات کے سبب مضمحل ہو رہی ہیں،اس کے علاوہ سائبر کرائم ،مذہبی منافرت،فرقہ واریت، سیاسی منافقت،سماجی ناہمواری ،معاشی بدحالی ،انسانی بے توقیری،تعلیم اور روزگار جیسے مسائل عصر رواں کے افسانوں میں جگہ پاتے ہیں۔

محمد غالب نشتر کے مطابق 1980 تک آتے آتے یہ موضوعات بھی ماند پڑ گئے اور ان کی جگہ بہت سارے نئے موضوعات نے جنم لیا،جن میں فرقہ واریت، دہشت گردی،اقلیتی مسائل،نسائی مسائل، دلت مسائل،شہری و دیہی مسائل ،سائبر کرائم ، بے روزگاری،حکومت پر عوام کا عدم اعتماد،انتظامیہ کی بے بسی، لاقانونیت، علاقائیت، قتل و غارت گری، مذہبی اور مسلکی تعصب جیسے بے شمار موضوعات دور حاضر کے اہم موضوع ہیں۔محمد غالب نشتر نے انہیں موضوعات کا ذکر اپنے اس مضمون میں غیر جانب دارانہ طریقے سے کیا ہے۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
07	78	43-48	حنا کوثر	حسین الحق کی افسانہ نگاری: چند اہم معروضات	2016	اگست	89

حسین الحق افسانہ نگاری کے تیسرے دور سے کہانیاں تخلیق کر رہے ہیں۔ افسانہ نگاری کا یہ وہ دور تھا جب افسانہ نگاری میں نت نئے تجربے ہو رہے تھے۔ افسانے میں علامت کا بول بالا تھا۔ شعور کی رو پر کہانیاں تخلیق کرنا ایک فیشن بن چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس رجحان اور اس رویہ کو اپنایا اور اس نئے طریقہ سے اپنایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جدید افسانوں کی دنیا میں انہوں نے اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔

حنا کوثر کا کہنا ہے کہ حسین الحق کا نام ان افسانہ نگاروں میں لیا جاتا ہے، جنہوں نے علامت کو تخلیقی بدل بنا کر اسلوب میں ڈرامائی فضا تیار کی۔ مذہب اور تصوف کے پس منظر نے ان کے افسانوں میں اعتبارات کی حیثیت اختیار کی۔ یہ ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے فرد کی بے سکونی اور کم مائیگی کا جواز مذہبی اور تہذیبی اقدار کے انقلاب میں تلاش کیا۔ ''نیو کی اینٹ''، ''نا گہانی، سبحان اللہ، مور پاؤں، پس مردہ شب وغیرہ ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں مذکورہ باتیں و موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں اور کہانیاں حسین الحق کی بہترین اور عمدہ کہانیاں تسلیم کی جاتی ہیں۔ اپنی انہیں تمام خصوصیات کی بنا پر حسین الحق کا نام اردو افسانوی دنیا میں موجود رہے گا۔

حنا کوثر کا کہنا ہے کہ اس مضمون میں حسین الحق کے افسانوں کا جائزہ ادھورا بھی ہے اور تشنہ بھی۔ ان کے بہت سے افسانوں پر سیر حاصل گفتگو کی جا سکتی ہے۔ بہر حال حسین الحق کے افسانوں کے یہ چند معروضات ہیں جن کے بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسین الحق بلا شبہ اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

شمارہ نمبر	جلد نمبر	صفحہ نمبر	مضمون نگار	مضمون	سال	ماہ	سلسلہ
08	78	73-75	معین الدین عثمانی	لامحدود کینوس کا جہانِ معانی میں ڈوبا ہوا احمد رشید کا افسانوی مجموعہ ''بائیں پہلو کی پسلی''	2016	اگست	90

احمد رشید کا درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ادب اور صحافت سے بھی گہرا تعلق رہا۔اسی لیے ان کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔اس کے علاوہ وہ ''مشرقی آواز'' کے نیوز ایڈیٹر بھی رہے، جو بیک وقت دہلی، گورکھپور اور علی گڑھ سے جاری ہوا کرتا تھا۔اس کے ساتھ ہی میگزین ''ندائے جمہوریہ'' میں بحیثیت مترجم اور میگزین ''لطیفہ'' علی گڑھ سے بھی وابستہ رہے۔

احمد رشید کی پہلی کتاب مضامین کا مجموعہ ''پہلا نقش'' کے عنوان سے 1975ء میں منظر عام پر آئی۔ اس مجموعے میں جملہ چھ مضامین شامل ہیں۔اس کے بعد ان کا ایک انشائیہ بعنوان ''گوہر آبدار'' مشہور رسالہ ''خاتون مشرق'' میں 1977ء میں شائع ہوا۔ان کا پہلا افسانہ ''شیشہ ٹوٹ گیا'' کے عنوان سے دہلی سے نکلنے والے رسالے '' شاہ جہاں'' میں شائع ہوا۔اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے ''وہ اور پرندہ''(2002ء)، ''بائیں پہلو کی پسلی''(2014ء) اور ''کھوکھلی نگر''(2019) میں منظر عام پر آکر اپنے حصے کی داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

معین الدین عثمانی کا کہنا ہے کہ احمد رشید کے افسانوں کا مجموعہ ''بائیں پہلو کی پسلی'' کا کینوس لامحدود معانی لیے ہوئے ہے۔اس مجموعے میں کل اکیس افسانے شامل ہیں۔ان فسانوں کے ذریعے احمد رشید نے قاری کو حقیقی زندگی سے براہ راست ملاقات کروا کے اپنے قلمی فریضے کو احسن طریقے سے ادا کیا ہے۔ایسی زندہ تحریروں کے سبب فکشن کے متوالوں میں احمد رشید کو ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
91	ستمبر	2016	کرشن چندر کا افسانہ ''شہزادہ'' ایک تجزیہ	کمل کشور	47-50	78	09

اس مضمون میں کمل کشور نے کرشن چندر کے مشہور ''شہزادہ'' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ان کا یہ افسانہ ہمارے سماج کی کچھ ایسی حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے،جن کی جڑیں ہمارے سماج میں پیوست ہیں اور آج کے ترقی یافتہ سماج میں بھی مسلسل مستحکم ہوتی جارہی ہیں۔غربت کے پس منظر میں سماج میں شادی کے متعلق مروج جہیز جیسی سماجی لعنت اور اس نتیجے میں نوجوانوں کی نفسیات 'خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی' کو موضوع بنایا گیا ہے۔لڑکے کی کسوٹی پر کھرا نہ اتر پانے اور اس کی خواہشات کے مطابق نہ ہونے کے سبب ایک نوجوان لڑکی کی نفسیاتی کیفیت ہی اس کہانی کا مرکزی نکتہ ہے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ عام انسانی مزاج کی خصوصیت کو بھی فن کار نے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

کمل کشور لکھتے ہیں کہ کررشن چندر کے اس افسانے کے اسلوب میں صداقت کے ساتھ ساتھ تصنع کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے بیانیہ انداز کو بھی برتا ہے۔افسانے کے کردار جیتے جاگتے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔غریبی ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے اور اس کے زیر اثر تمام بدعنوانیاں فروغ پاتی ہیں۔جہیز جیسی لعنت کو بھی غریبی کے سبب ہی فروغ ملتا ہے۔یہی اس افسانے کا پس منظر ہے۔

کمل کشور کا ماننا ہے کہ اس افسانے کی زبان سادہ،سلیس اور رواں ہے۔زبان میں رنگینی،شیرینی، اور لطافت کا خوبصورت عنصر پایا جاتا ہے۔یہ افسانہ ہمارے معاشرے کے اتنا قریب ہے کہ اس کے نقوش قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے۔کرشن چندر نے بے حدفنی چابک دستی سے کام لیا ہے بلاشبہ ان کا یہ افسانہ ''شہزادہ'' ایک کامیاب تخلیق ہے۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
92	نومبر	2016	غلام عباس اور جاڑے کی چاندنی	محمد قاسم	35-29	78	11

اس مضمون میں محمد قاسم نے غلام عباس کے دوسرے افسانوی مجموعے ''جاڑے کا چاندنی'' کی تمام کہانیوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔غلام عباس ن کا پہلا طبع زاد افسانہ ''مجسمہ'' 1933ء میں شائع ہوا۔غلام عباس کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آنندی'' کے عنوان سے 1924 میں منظر عام پر آیا۔اس میں کل دس افسانے شامل تھے۔

غلام عباس کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''جاڑے کی چاندنی'' کے عنوان سے 1960 میں شائع ہوا۔یہی اس مضمون کا عنوان بھی ہے۔اس مجموعے میں جملہ چودہ افسانے شامل ہیں۔اس میں شامل افسانوں کے نام ''اوورکوٹ''، ''اس کی بیوی''، ''بھنور''، ''بامبے والا''، ''سایہ''، ''سرخ جلوس''، ''فینسی ہیر کٹنگ سیلون''، ''بردہ فروش''، ''تنکے کا سہارا''، ''تپلی بائی''، ''مکر جی بابو کی ڈائری''، ''ایک دردمند دل''، ''دوتماشے'' اور ''غازی مرد'' ہیں۔

اس مجموعے کے تمام افسانوں کا تجزیہ کرنے کے بعد محمد قاسم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''جاڑے کی چاندنی'' کو وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوسکی، جو آنندی کے حصے میں آئی۔نقادوں نے جاڑے کی چاندنی کا مطالعہ کرنے میں ناانصافی کی عام طور پر ہمارے نقادوں کا حال یہ ہے کہ وہ کسی بھی فنکار کی اسی تخلیق کو اپنا موضوع بناتے ہیں، جسے بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہو۔اس لیے ''آنندی'' کی مقبولیت کے سامنے ''جاڑے کی چاندنی'' پر بہت کم لکھا گیا ہے۔جب کہ اس میں بعد افسانے ایسے ہیں جو فنی طور پر یقیناً ہمیں غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

سلسلہ	ماہ	سال	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر	جلد نمبر	شمارہ نمبر
93	دسمبر	2016	زاہدہ حنا کے افسانوں میں تاریخی شعور	رخسانہ بیگم	48-52	78	12

رخسانہ بیگم نے اس مضمون میں زاہدہ حنا کے افسانوں میں تاریخی شعور کی نشاندہی کی ہے۔ زاہدہ حنا نے اپنی زندگی کا آغاز افسانے سے کیا۔اس کے بعدانہوں نے ناول، ڈرامے اور مضامین بھی لکھے۔اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے ''قیدی سانس لیتا ہے''، راہ میں اجل ہے''، ''تتلیاں ڈھونڈنے والی'' اور ''رقص بسمل'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ان مجموعوں میں جملہ 32افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ناول ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی''اور ایک مضامین کا مضموعہ ''عورت زندگی کا زنداں'' شامل ہے۔

زاہدہ حنا ایک ہمہ جہت افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں ایک خاص طرز احساس ملتا ہے۔ زاہدہ کے اکثر افسانوں میں قبل مسیح کے نیم تاریخی اساطیری واقعات جا بجا ملتے ہیں۔تاریخی کردار ہوں یا واقعات، ان کے افسانوں کا لازمی جز بن جاتے ہیں۔ حکائتیں، داستانوی اسلوب، فلسفہ، وقت کے عناصر یہ سب ان کی کہانیوں میں بہ درجہ اتم پایا جاتا ہے۔

رخسانہ بیگم کا کہنا ہے کہ گو کہ ان کے افسانے طویل ہوتے ہیں،لیکن اکثر ان کے موضوعات کے لیے یہ طوالت ناگزیر بھی ہو جاتی ہے۔مگر مختصر جملوں کے پیرائے میں صدیوں کی بات کر جانا ان کی تحریروں کی خاص خوبی ہے۔ان مختصر جملوں کے پوشیدہ مفہوم کبھی ہمیں الہامی کتابوں میں ملتے ہیں تو کبھی تاریخ کے اوراق میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور کبھی قرآن کی آیتوں میں۔غرض قاری کو دنیا کے تمام مذاہب و تاریخ کی سیر کراتے ہوئے انسانیت کی منزل پر لا کھڑا کرتی ہیں۔زاہدہ حنا اس میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔

حاصل مطالعہ

حاصل مطالعہ

ادبی تحقیق میں مواد کی فراہمی کا ایک وسیلہ رسائل بھی ہیں۔ بلکہ رسائل کو کتابوں پر یک گونہ تقدم و فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ کتابیں محقق کی نظر میں ہوتی ہیں لیکن رسائل ایسے سمندر کے مانند ہوتے ہیں جو اکثر خود بھی مخفی ہوتے ہیں لیکن ان کے دامن میں مواد کے گوہر آبدار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ان تک رسائی ریگستان میں پانی تلاش کرنے کے مانند ہے۔مواد کی تلاش میں ریسرچ اسکالر ان میں سے ہر رسالے کی فائل کھنگالے یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے عمر نوح درکار ہے۔اس مشکل گھڑی میں جادہ تحقیق کے مسافر کی رہنمائی رسائل کا اشاریہ کرتا ہے جو اسے بتاتا ہے کہ اس کا مطلوبہ مواد کس رسالے میں ہے۔

حیدرآباد سے نکلنے والے اردو رسائل کا تجزیہ مجموعی حیثیت سے رسائل کی صنفی خصوصیت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتا ہے۔حیدرآباد کے رسائل نے بھی اپنے سماج کی اور اپنے ادوار کی تصویر کشی کے ساتھ تنقید بھی کی ہے۔یہاں سے بے شمار رسالے جاری ہوئے۔حیدرآباد کے رسائل کا مطالعہ کرتے ہوئے ان تمام باتوں کے ساتھ اس کے ادبی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں سے نکلنے والے رسائل نے بھی اردو کے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا نیز اردو ادب کو کئی مشہور اور نامور ادیب و شاعر دے۔ حیدرآباد سے مختلف ادبی رسالے نکلے اس میں سے ایک اہم ادبی رسالہ ''سب رس'' ہے۔

رسالہ ''سب رس'' بہ طور ماہ نامہ جنوری ۱۹۳۸ء میں زیر نگرانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدرآباد دکن سے جاری ہوا۔اس کے ابتدائی ایڈیٹر صاحبزادہ میر محمد علی میکش تھے مگر دوسرے سال سنہ ۱۹۳۹ء میں ایک مجلس ادارت بنائی گئی جس میں صاحبزادہ میکش کے علاوہ خواجہ حمید الدین شاہد، سکینہ بیگم اور معین الدین احمد انصاری شامل تھے۔اور نگران ڈاکٹر زور تھے۔بعد کے زمانے میں مختلف اصحاب نے ذمہ داری سنبھالی ''سب رس'' ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ہے۔جو ہر مہینے اردو زبان وادب کی خدمت کے لیے شائع ہوا کرتا ہے۔اس ادارے نے اب تک سنجیدہ علمی و ادبی کتابیں شائع کر کے جو اردو کی خدمت کی ہے وہ علم دوست اصحاب سے مخفی نہیں ہے۔

روز اول سے تا حال اس رسالہ ''سب رس'' نے ایسے مضامین پیش کیے ہیں جن کی روشنی میں ہر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ مضامین نہ صرف علمی اعتبار سے بہتر ہیں بلکہ سماجی فکر بھی اس میں موجود ہے۔

رسالہ سب رس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے اردو کے بلند پایہ انشاپردازوں، شاعروں، ادیبوں کے علاوہ دوسری زبانوں خاص کر ہندی، مراٹھی، تلگو اور کنڑ وغیرہ کے ادبی جواہر پاروں کو بھی ادبی حلقوں میں متعارف کرایا۔ ادبی زاویے سے اگر دیکھا جائے تو رسالہ سب رس یقیناً ادب میں ایک اونچا مقام رکھتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی اہم علمی و ادبی اور تحقیقی رسالہ ہے جو ابھی تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو ہندوستان میں مخطوطات اور قدیم کتابوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ جس کے نادر ذخیرے سے ملک اور بیرون ملک کے محققین اپنے تحقیقاتی کام کے سلسلہ میں آئے دن استفادہ کرتے ہیں۔ اس بنا پر بھی رسالہ سب رس کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ یہ رسالہ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بھی اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

ہندوستان کے ادبی رسالوں میں ''سب رس'' کی اپنی انفرادیت ہے۔ پچھلے 80 برسوں سے یہ رسالہ زبان اور علم و ادب کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ پچھلے تقریباً 80 سال سے علمی و ادبی مضامین اور شعری تخلیقات کا ایک بہت بڑا سرمایہ ''سب رس'' کی زینت بنتا رہا ہے۔

سب رس نے اچھوتے موضوعات پر بھی کئی نمبر شائع کیے ہیں۔ مثلاً ریڈیو نمبر، محرم نمبر، اقبال نمبر وغیرہ۔ اردو رسائل کی تاریخ میں ''سب رس'' حیدرآباد کا واحد رسالہ ہے جس نے نہ صرف اپنے معیار کو بلند رکھا بلکہ 80 برس سے برابر شائع ہو رہا ہے۔

یہ رسالہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا ترجمان ہے۔ اس ادارے کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے چند مخلصین اردو یعنی پروفیسر عبدالقادر سرودی، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی اور مولوی نصیر الدین ہاشمی کے تعاون سے 1931ء میں قائم کیا۔ اس ادارہ کے حسب ذیل اغراض و مقاصد تھے۔

(1) اردو زبان و ادب کی توسیع اور حفاظت۔

(2) سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا۔

(3) ملک کے نوجوانوں میں انشاپردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

(4) عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لیے ضروری وسائل اختیار کرنا۔

(5) اردو کو مختلف علوم وفنون سے روشناس کرانا۔

(6) تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت۔

آج شاید ہندوستان کا کوئی ادبی رسالہ ایسا نہیں ہے جو نصف صدی سے بھی زیادہ کی مدت سے اردو کی خدمت میں آب وتاب سے لگا ہوا ہو۔ پچھلی پون صدی سے علمی اور ادبی مضامین اور شعری تخلیقات کا ایک بہت بڑا اسرمایہ ''سب رس'' کی زینت بنتا رہا ہے۔

سب رس کے عہد کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں تحقیقی وتنقیدی مضامین، کے علاوہ غزلیات، مرثیے، مثنویاں، مناجات، گیت، قصائد، طنز ومزاحیہ مضامین، سفرنامے اور سماجی مضامین شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ دکنیات، مخطوطات، شعروسخن تنقید وتبصرے، افسانے، قطعات، وغیرہ بھی ''سب رس'' کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ان موضوعات اور تخلیقات سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ ماہ نامہ ''سب رس'' کس قدر وقیع اور ادبی رسالہ ہے اور یہ کیسے زبان وادب کی خدمت کر رہا ہے۔

یہ ہوئی ماضی کی بات، جب 1995 سے 2016 کی درمیانی مدت میں شائع شدہ سب رس کے مواد پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سب رس کی پالیسی اور اس کے مزاج میں کافی فرق آیا ہے۔ زور صاحب کے زمانے میں سب رس میں تحقیقی مضامین کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، لیکن موجودہ زمانے میں تحقیقی مضامین کی اشاعت میں کمی آئی ہے۔ ان کی جگہ تنقیدی مضامین نے لے لی ہے۔ تنقید میں بھی افسانوی تنقید پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ افسانوی تنقید میں بھی خاص طور سے عصر حاضر کے افسانہ نگاروں اور افسانوں پر لکھے گئے مضامین کو ترجیح دی جارہی ہے، جو موضوعات اور میعار کے اعتبار سے عصری تقاضوں اور عصری رجحانات سے ہم آہنگ ہے۔

اس مقالے میں شامل افسانوی مضامین، جن کا توضیحی اشاریہ پیش کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔ 1995 میں افسانے سے متعلق ایک بھی مضمون نہیں ہے۔ 1996 میں ایک مضمون، 1997 میں ایک، 1998 میں ایک، 1999 میں ایک، 2000 میں آٹھ، 2001 میں چھ، 2002 میں چار، 2003 میں ایک بھی نہیں، 2004 میں تین، 2005 میں تین، 2006 میں چھ، 2007 میں ا یک، 2008 میں تین، 2009 میں ایک بھی نہیں، 2010 میں چار، 2011 میں دو، 2012 میں دو، 2013

میں تین، 2014 میں گیارہ، 2015 بائیس اور 2016 میں دس مضامین شامل ہیں۔اس طرح کل ملا کر اس مقالے میں جملہ 93 افسانے سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں فی زمانہ سب رس نے افسانے سے متعلق مضامین کوزیادہ شائع کیا ہے۔

المختصر یہ کہ سب رس میں افسانے سے متعلق بہت سے معیاری مضامین شائع ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ کئی بڑے ناقدین کے مضامین بھی اس رسالے کی زینت بنے ہیں۔مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون ''مظہر الزماں خاں کے نئے افسانے''، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا مضمون ''قدیر زماں کی افسانہ نگاری''، بلراج کومل کا مضمون ''بیگ احساس کے افسانے:ایک مطالعہ''عتیق اللہ کا مضمون ''اردو افسانہ:ایک صدی'' پروفیسر علی احمد فاطمی کا مضمون ''عبدالصمد کے منتخب افسانے:ایک سرسری جائزہ''، پروفیسر انوارالدین کا مضمون ''چودہ زبانیں چودہ کہانیاں''، پروفیسر بیگ احساس کا مضمون ''ساجد رشید کی افسانہ نگاری''، وغیرہ۔ اس کے علاوہ اقبال مجید، انور قمر، ندا فاضلی، حسین الحق، سلام بن رزاق، نورالحسنین، مرزا حامد بیگ، معین الدین عثمانی، سید محمد اشرف، سید احمد قادری جیسے معروف تخلیق کاروں کے افسانے سے متعلق مضامین بھی رسالہ سب رس کی زینت بنتے رہے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی 1995 سے 2016 کی مدت کے دوران رسالہ سب رس نے اردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی ہے جس کا اندازہ اس کے مختلف شماروں میں شائع شدہ تخلیق کاروں، نقادوں، محققوں اور شاعروں کی تخلیقات کے اشاریہ سے کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

کتابیات

کتابیات

بنیادی ماخذ

سلسلہ	نام	مقام اشاعت	مہینہ، سن عیسوی
1	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جولائی، 1996
2	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جنوری، فروری، مارچ 1997
3	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	اگست، 1998
4	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	اگست، 1999
4	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جنوری، جون، اگست، ستمبر 2000
6	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جنوری، جولائی 2001
7	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جنوری، 2002
8	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جنوری، اکتوبر، نومبر 2004
9	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	فروری، دسمبر 2005
10	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	مارچ، جولائی، اگست، ستمبر، نومبر 2006
11	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جون، 2007
12	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	مارچ، اپریل، جولائی 2008
13	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	مارچ، اگست، ستمبر 2010
14	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	ستمبر، اکتوبر 2011
15	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	اپریل، مئی 2012
16	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	فروری، دسمبر 2013

17	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جنوری، مارچ، اپریل، جون، ستمبر، اکتوبر، دسمبر 2014
18	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	جنوری تا دسمبر 2015
19	سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	مارچ، اپریل، جولائی، اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر 2016

ثانوی ماخذ

سلسلہ	مصنف	تصنیف	ناشر	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	ابرار الباقی، ڈاکٹر	ڈاکٹر زور کی کتابوں کا وضاحتی اشاریہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس	دہلی	2009
2	خواجہ حمید الدین شاہد	ادارۂ ادبیات اردو	اعظم اسٹیم پریس	حیدر آباد	1943
3	شارب ردولوی، پروفیسر	جدید اردو تنقید اصول ونظریات	اتر پردیش اکادمی	لکھنؤ	2002
4	طیب انصاری	حیدر آباد میں اردو صحافت	مکتبہ شاداب ریڈ ہلز	حیدر آباد	1980
5	عبد الستار دلوی، ڈاکٹر	ادبی اور لسانی تحقیق	ممبئی یونیورسٹی، پریس	ممبئی	1984
6	عطیہ رحمانی	ڈاکٹر زور شخصیت اور کارنامے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس	دہلی	1996
7	گیان چند جین	تحقیق کا فن	ایجوکیشنل بک ہاوس	علی گڑھ	2009
8	محمد ناظم علی، ڈاکٹر	حیدر آباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد سے حال تک	گونج پبلی کیشنز	نظام آباد	2010
9	محبوب فرید، ڈاکٹر	صحافتی کہکشاں	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس	دہلی	2015
10	منصور احمد، ڈاکٹر	اصول تحقیق وترتیب متن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس	دہلی	1977

رسائل وجرائد:

سلسلہ	رسالے کا نام	جلد نمبر	شمارہ نمبر	مقام اشاعت	اشاعت ماہ وسال
1	آج کل (تحقیق نمبر)	04	08	نئی دہلی	اگست 1967
2	آج کل (صحافت نمبر)	37	12,11	نئی دہلی	نومبر، دسمبر 1983
3	سب رس (پہلا شمارہ)	01	01	حیدرآباد	جنوری 1938
4	سب رس (ڈاکٹر زور نمبر)	44	03	حیدرآباد	مارچ 1982
5	سب رس (ادارۂ ادبیات اردو نمبر)	03	05	حیدرآباد	مئی 1941

Department of urdu

School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad

This is to certify that the dissertation entitled **"SABRAS MEIN URDU AFSANE SE MUTA'ALIQ MAZAMEEN KA TAUZHEEHI ESHARIYA (1995-2016)"** submitted by **Ms. FAHMIDA AYESHAH** Reg. No.**17HUHL03** in partial fulfil of the requirment for the award of the degree of **Master of Philosophy (M.Phil)** in Urdu is a bonafide workcarried out by har under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part of full to this or any other university or institution for the award of any Degree or Diploma.

Part af this dissertation has been presented in the following conferenc:

1. Paper titled **"Sabras ki Ilmi-o-Adabi Khidmaat"** one day National Seminar Conducted by Osmania University College for Women Koti, Hyderabad on 11th January 2019.

Signature of the Supervisor

Head of the Department

Dean School of Humanitis

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled **"SABRAS MEIN URDU AFSANE SE MUTA'ALIQ MAZAMEEN KA TAUZHEEHI ESHARIYA (1995-2016)"** submitted by **Ms. FAHMIDA AYESHAH** Reg. No.**17HUHL03** in partial fulfil of the requirment for the award of the degree of **Master of Philosophy (M.Phil)** in Urdu is a bonafide workcarried out by har under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part of full to this or any other university or institution for the award of any Degree or Diploma.

Signature of the Supervisor

Head of the Department

Dean School of Humanitis

Place: Hyderabad

Date:....................

DECLARATION

I, **FAHMIDA AYESHAH**, hereby, declare that this dissertation entitled **"SABRAS MEIN URDU AFSANE SE MUTA'ALIQ MAZAMEEN KA TAUZHEEHI ESHARIYA (1995-2016)"** submitted by me under the supervision of **Dr. MOHD KASHIF** is a bonafide research work wich is also free from plagiarism.

I also declare that it has not been submitted prevouselyin part of full to this University of any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodhganga/INFLIBNET.

Signature of the student

Place: Hyderabad

Name: FAHMIDA AYESHAH

Date: ....

Reg. No.17HULHL03

SABRAS MEN URDU AFSANE SE MUTA'ALIQ

MAZAMEEN KA TAUZHEEHI ESHARIYA(1995-2016)

(Descriptive Index of articles on short stories published in monthly Sabras Hyderabad 1995 to 2016)

DISSERTATION

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfilment of the requirement for the award of degree

Master of Philosophy

Submitted By

FAHMIDA AYESHAH

Enrollment No. 17HUHL03

Under The Supervision of

DR. MOHD KASHIF

Department of Urdu

School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad - 500046

JUNE-2019